سائے ہم سفر

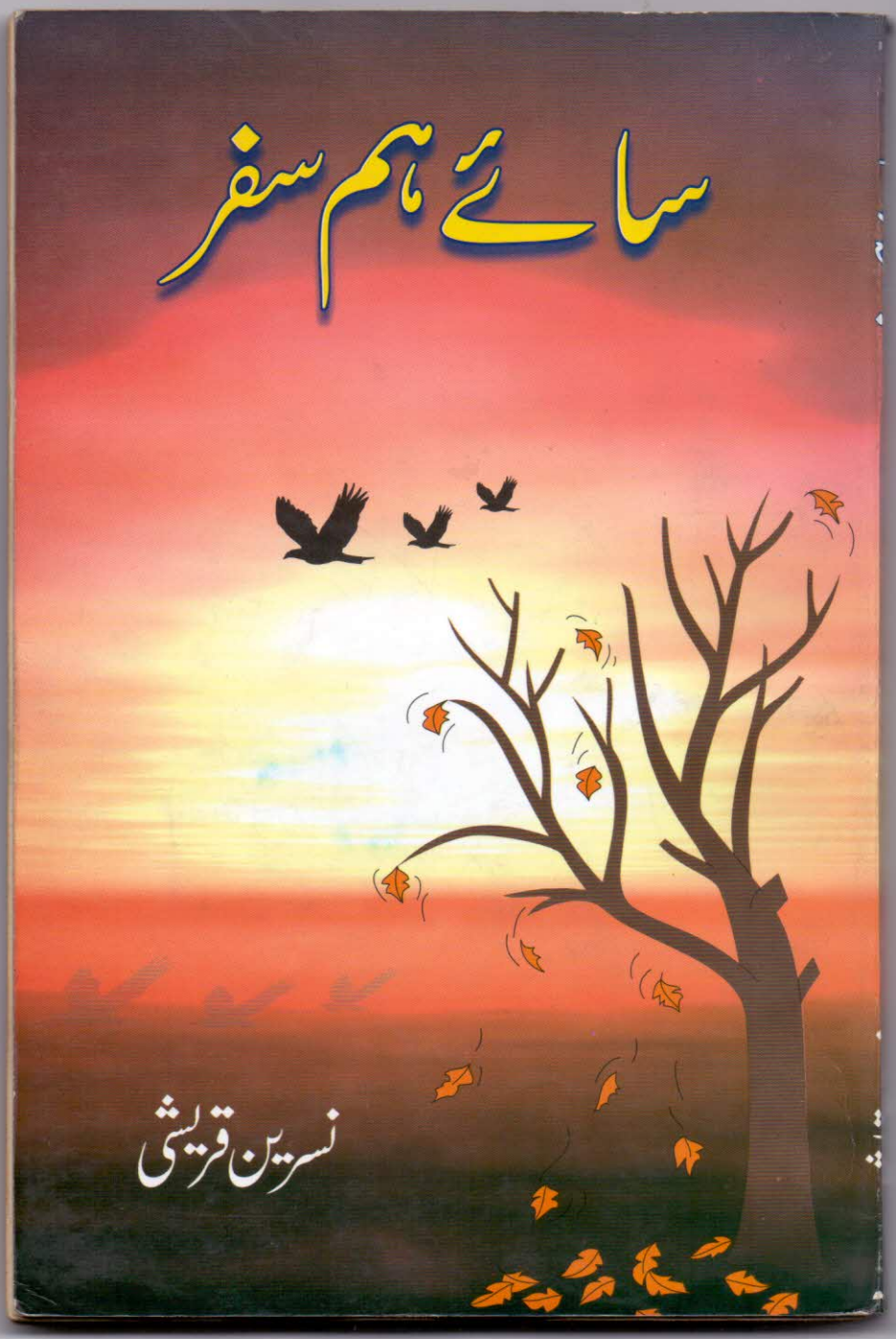

نسرین قریشی

پہلا باب

مجھے امریکا آئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے کو ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ جہاز کا سفر کیا وہ سات سمندر پار جو کہ چھتیس گھنٹے میں جا کر پورا ہوا۔ چوبیس گھنٹے زمین سے ہزاروں فیٹ کی بلندی پر فضا میں اور باقی بارہ گھنٹے دو جگہ جہاز کے رکنے کی نظر ہوئے اور کچھ لیل و نہار کی گردش کے۔

تھکی ہاری جب مینیا پلس پہنچی تو فیروز چچا ہاتھ ہلاتے میری طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے آئے۔ میں تو انہیں ڈھونڈنے میں شاید کچھ دیر لگاتی لیکن وہ سیدھے میری طرف ہی آئے اور فوراً گلے لگا کر بولے۔

''بیٹی اچھا کیا تم آ گئیں۔''

ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے مسافروں کا سامان جمع ہونے کی جگہ پہنچ گئے اور کچھ ہی دیر میں چچا اور میں حدِ نگاہ تک پارک کی ہوئی گاڑیوں سے گزرتے ہوئے چچا کی گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجال ہے کہ کوئی گاڑی اپنی مقررہ جگہ سے تجاوز کر کے کھڑی ہوتی۔ سب گاڑیوں میں مناسب فاصلہ تھا اور ہر کوئی اپنی سہولت سے نکال سکتا تھا۔ میرے آدھے

سوئے ہوئے ذہن میں سوال ابھرا کہ میرے ملک میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

ابھی تک پیرس اور نیویارک کے ہوائی اڈوں کے طول وعرض اور شان وشوکت سے متاثر ہو رہی تھی لیکن مینیاپلس کے ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو آنکھیں ہی ششدر رہ گئیں۔ رات بھی اتنی روشن کہ چھوٹی سی چیز بھی نہ نظروں سے اوجھل ہو سکے۔ نہ ہی انسانوں کی دھکم پیل نہ ہی گاڑیوں کا طوفان بے تمیزی۔ گھر تک کا راستہ زیادہ تو خاموش ہی گزرا۔ شاید فیروز چچا کو احساس تھا کہ میں کتنی تھک چکی ہوں گی۔ امی ابو کا حال پوچھنے کے بعد چچا نے میری پڑھائی کا پوچھا اور کچھ دیر بعد ہم ایک نسبتاً سنسان سے علاقے میں داخل ہو گئے۔ چچا کی آواز نے مجھے میٹھی میٹھی اونگھ سے جگا دیا۔

''بیٹی یہ میرا ڈریم ہاؤس ہے۔''

اور ہم جنگل میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سڑک سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑے گھر کے باہر رک گئے۔ نہ چچا نے ہارن پہ ہارن بجا کے اپنی آمد کی اطلاع دی اور نہ ہی کوئی ملازم باہر آیا۔ بلکہ چچا نے میرے دونوں سوٹ کیس خود ہی اٹھائے اور ہم دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ چچا بولے:

''بیگم آ جاؤ بھئی، ہم لوگ آ گئے ہیں۔''

اور پہلا دھچکا مجھے یہ لگا کہ چچی جان نے جینز اور ٹی شرٹ یوں پہن رکھی تھی جیسے ان کا آبائی لباس ہو۔ میرا ماتھا چوما اور مجھے سر سے پاؤں

تک ایک ہی نظر میں جانچ کر بولیں۔

''ارے بھئی واہ لگتا ہے احسن اور حمیرا نے تمہاری اٹھان پچھلی صدی میں اٹھائی ہے۔''

''چچی میں سمجھی نہیں۔''

''چلو چھوڑو ذرا فریش اپ ہو جاؤ پھر کھانا کھائیں گے۔ آج تمہارے ساتھ دوبارہ سہی۔''

''چچی مجھے تو معاف ہی رکھیں بالکل بھوک نہیں ہے اور جہاز میں بھی کھانا ملتا رہا۔''

چچی نے بالکل اصرار نہ کیا اور مجھے میرا بیڈ روم دکھانے چل پڑیں۔ ان کے جاتے ہی میں دھڑام سے بستر پر لیٹی اور کچھ ہوش نہ رہا۔ جب آنکھ کھلی تو ذہن کچھ کام کرتا ہوا لگا گھڑی پر نظر پڑی تو چھ بجے تھے سوچا یہ تو بہت جلدی آنکھ کھل گئی مگر پردہ ہٹا کر دیکھا تو سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ اپنے منہ پر دو چار طمانچے مارے کہ چکر کیا ہے میں نیند میں تو نہیں ہوں لیکن جب یہ شبہ بھی دور ہو گیا تو پھر کیا تھا۔ چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر نکلی۔ سامنے سے میری ماڈرن زمانے کی چچی آتی دکھائی دیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

''شکر ہے تم اٹھ گئیں چچا کہہ رہے تھے کھانا تمہارے ساتھ کھائیں گے۔''

''چچی جان چھ بجے کون سا کھانا؟ اور یہ سورج کیا رات کے تین بجے ہی نکل آتا ہے کہ چھ بجے اتنا اوپر ہے؟''

ساتھ والے کمرے سے چچا فیروز کی آواز آئی۔

''ارے بھئی یہ شام کے چھ بجے ہیں۔ اور بیٹی آپ پورے اٹھارہ گھنٹے سوئی ہو۔''

پیشتر اس کے کہ دماغ بالکل ہی ماؤف ہو جاتا میں نے دس منٹ کی مہلت مانگی جلدی سے شاور لیا اور جو کپڑے بھی سامنے پڑے تھے پہنے اور دونوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ کھانا تو چچی نے بنایا ہی مزے دار تھا کچھ ماحول سے اور بھی فرحت بخش لگ رہا تھا۔

کھانے کے کمرے میں بڑی بڑی کھڑکیاں ایک لکڑی کے بنے ہوئے ٹیرس پر کھلتی اور ٹیرس سے سیڑھیاں لان میں اترتی۔ لان کے بعد گھنا جنگل جو کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ بھی چچا کی ہی زمین ہے کاش میری سہیلیاں شانزے، آمنہ اور ماہا میرے ساتھ ہوتیں تو جنگل میں گھومنے کا شوق تو پورا ہو جاتا مگر اس وقت تو یہ دو بزرگ ہی میرے کمپنی تھے۔ دادی نے ایک دفعہ ان کے بچوں کا ذکر تو کیا تھا مگر گھر میں ان کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹیرس سے ذرا ہٹ کے ایک چبوترا سا تھا۔ میرے پوچھنے پر چچا نے بتایا کہ وہ نہانے کا گرم ٹب تھا اور بقول چچا کے سردیوں میں جب خوب برف پڑی ہو تو اس میں نہانے کا مزا ہی اور ہے۔ ان کی یہ بات بالکل ہی

میرے سر کے اوپر سے گزر گئی اور میں نے مزید سوال کئے بغیر ٹھنڈا ٹھنڈا انگور کا جوس حلق میں اتارنا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد چچا نے مجھے گھر کا چکر لگوایا اور چچی شاید کچن میں مصروف ہو گئیں۔ سب سے پہلے نیچے تہہ خانے میں اترے۔ بڑا سارا ہال اور بڑی بڑی کھڑکیاں کمال مہارت سے زمین کھود کر ہال کو روشن اور کشادہ کرنے میں مددگار۔ ایک طرف تو ورزش کرنے کی بہت ساری مشینیں رکھی ہوئی۔ دوسری طرف ٹیبل ٹینس کھیلنے کی میز اور ایک طرف بلیئرڈ کھیلنے کا میز۔ سب لوازمات کو دیکھ کر چچا بولے: ''بیٹی جب تینوں بچے گھر میں تھے تو یہاں کافی رونق ہوا کرتی تھی۔'' میری ہمت نہ ہوئی کہ پوچھتی ''اب کہاں ہیں.....'' خاموشی سے چچا کے پیچھے باقی گھر کے دورے پر اوپر آ گئی۔ سب کمرے مناسب فرنیچر سے سجائے گئے تھے۔ سب چیزوں کے رنگ ہلکے ہلکے اور آپس میں ہم آہنگ۔ میرے ملک میں بھی کئی بستیاں بڑے بڑے گھروں سے بھری پڑی ہیں مگر ایسا سلیقہ اور قرینہ کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ خیر کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی اور جلد ہی محفل برخاست ہوئی کیونکہ چچا اور چچی کو صبح کام پہ جانا تھا۔

اگلے دن صبح اٹھی تو پتا چلا کہ میں گھر میں اکیلی تھی۔ پہلے تو کچھ عجیب بھی لگا اور کچھ ڈر بھی لگا۔ لیکن شکر ہے چچی کے فون سے تسلی ہو گئی انہوں نے بتایا کہ خدانخواستہ اگر کوئی گھر میں غیر داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو

دو منٹ میں پولیس پہنچ جائے گی کیونکہ سیکورٹی الارم لگا ہوا تھا..... تسلی تو ہو گئی مگر شام کو دونوں بزرگ آئے تو مجھے چین آیا۔ چچی کو سکرٹ اور کوٹ میں دیکھ کر چچی نے میری حیرانی محسوس کر لی اور بولیں۔

''بیٹی جاب پر یہ کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔''

اور میری پیاری دادی کی بات میرے کانوں میں گونجنے لگی کہ ''انسان جس ماحول میں رہتا ہے آہستہ آہستہ اس کے رنگ ڈھنگ اپنا لیتا ہے۔'' میں نے سوچا کہ اگر اس گھر میں روزانہ یہی معمول رہے گا تو میری چھٹیوں کا یہ مہینہ تو بہت بوریت کا گزرے گا۔

پاکستان میں ہوتی تو کم از کم سب سہیلیاں فارغ وقت میں اکٹھی ہوتیں۔ ماہا کی منگنی پر کتنا مزا آیا تھا۔ اس کے منگیتر کو آمنہ نے اور میں نے اتنا ستایا تھا کہ بے چارے کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔ ماہا نے یونیورسٹی میں داخلہ تو لے لیا ہے لیکن امید نہیں کہ اس کی ساس اس کو پڑھائی مکمل کرنے دے۔ آمنہ اور شانزے تو میٹرک کر کے ہی ہوم اکنامکس میں چلی گئی تھیں۔ لیکن گھر قریب ہونے کی وجہ سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اور میں؟ میرے تو ابھی پورے تین سال کافی مشکل ہیں۔ کیوں نہ ہوں! پاکستان کی نامور ڈاکٹر جو بننا ہے۔ اور فرسٹ پراف کے بعد یہ تھوڑی سی چھٹیاں ملیں تو ان بزرگوں کی نظر ہو جائیں گی۔ خیر ہفتہ تو یونہی گزر گیا لیکن اب چچا اور چچی نے خوب سیر کرانی شروع کی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی کام

کے لیے جائیں میں ساتھ چلی جاتی ہوں۔ صبح دیر سے اٹھتی اور ناشتہ کر کے یہاں کے سلسلہ وار ڈرامے دیکھنا میرا روزانہ کا معمول ہے اور شام کو بازاروں میں۔ یہاں کی صفائی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ جس طرح دادی کہتی تھی کہ انسان دن میں پانچ دفعہ وضو کر کے بالکل پاک ہو جاتا ہے مجھے تو لگتا ہے یہ پورا شہر دن میں پانچ دفعہ جیسے صاف ہوتا ہے۔

سارے شہر میں صرف مٹی کی زمین تو نظر ہی نہیں آتی۔ ہر طرف گھاس ہی گھاس ہے۔ درختوں کے تنوں کے گرد اور کیاریوں میں مٹی کی جگہ یا تو چھوٹی چھوٹی بجری پڑی ہوتی ہے یا لکڑی کا برادہ۔ سب ٹھیک ہے مگر یہاں کی بے حیائی دل کو بہت ناگوار لگتی ہے سر عام لڑکے لڑکیاں محبت کے اظہار کو معیوب نہیں سمجھتے اور کتنا بھی صرفِ نظر کرو کسی نہ کسی پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے بہت بڑے بڑے بازار ہیں اور کئی کئی منزلہ عمارتیں۔ سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈی۔ پوری عمارت بازار تو کیا ایک تفریح گاہ ہوتی ہے جگہ جگہ خوبصورت بینچ آرام کے لیے رکھے ہیں۔ بڑے بڑے درخت اور خوب صورت بیلیں نہایت موزوں جگہوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب درخت اور پودے اصلی لگتے ہیں۔ عمارت کے اندر ہی ریستورانٹ ہیں کئی کئی غسلخانے ہیں ہر وقت شیشے کی طرح چمکتے ہیں۔ شکر ہے مرد اور عورتوں کے علیحدہ ہیں۔ ایک پلازہ میں گھومنے کے لیے کم از کم ڈھائی تین گھنٹے لگ ہی جاتے ہیں۔ ایک منزل سے دوسری منزل تک

جانے کے لیے لفٹیں اور اسکیلیٹر ہیں۔ کئی کئی سو لوگ اپنی ہی دھن میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ کسی کو کسی کی طرف گھورنے کی فرصت ہی نہیں۔ یا عادت نہیں کبھی کبھی بڑے اخلاق سے مجھ سے کوئی سوال کر لیتا ہے۔

''آپ کس ملک سے آئی ہیں.....'' شاید میرا لباس دیکھ کر کیونکہ یہاں ایشین لوگ تقریباً ناپید ہیں۔ اگر کوئی ہیں بھی تو امریکن رنگ میں رنگے ہوئے۔ دادی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ ''انسان جیسی صحبت میں رہتا ہے رفتہ رفتہ اسی میں ڈھل جاتا ہے۔''

سڑک پر مرد اور عورتیں بڑی بے فکری سے جاگنگ کرتے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ جوتے تقریباً سب نے بھاری بھرکم پہنے ہوتے ہیں۔ لباس میں مردوں نے صرف ایک نیکر اور خواتین نے ایک چھوٹی سی نیکر کے ساتھ سینے پہ بھی ذرا سا کپڑا چپکایا ہوتا ہے۔ حد ہو گئی ہے بے حیائی کی۔ بہت عرصہ پہلے دادی آئی تھیں لیکن پندرہ دن میں ہی واپس چلی گئیں اور اکثر کہتیں۔ ''اگر کسی نے اپنی نسل خراب کرنی ہو تو امریکا چلا جائے۔'' ان کی یہ بات اب میری سمجھ میں آ رہی ہے۔

پچھلے دنوں میں چچی کے ساتھ آرٹ میوزیم دیکھنے چلی گئی

اف! توبہ ہے۔ وہاں تو بالکل الف ننگے مرد اور ننگی عورتوں کی تصاویر پوری پوری دیوار پر آویزاں تھیں۔ یقیناً وہ نامور مصوروں کی تھیں مگر دیکھنے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا اور متلی سی ہونے لگی تھی۔ یہاں تک کہ بی بی مریم کو بھی

کافی بے باکی سے کینوس پر رنگا ہوا تھا۔ کوئی تعریفی فقرہ تو کیا ہی منہ سے نکلتا۔ توبہ! توبہ ہی کہتی رہی جبکہ چچی بار بار کہتیں کہ فلاں فلاں کی تصویر ہے۔ حالانکہ سب تصاویر کا تعارف ان کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ چچی بولیں:

''بھئی جو مشہور پینٹنگز ہیں ان کے پوسٹر ہی خرید لو۔'' میں نے سنی ان سنی کی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی بولی۔

''چچی بہت بھوک لگ رہی ہے اب گھر چلیں۔''

باہر نکلے تو تازہ ہوا میں سکھ کا سانس لیا۔ کاش یہ لوگ جنس کو اتنا بے پردہ نہ کرتے جتنا کر چکے ہیں۔ بھلا اب باقی کیا چھوڑا ہے؟ اچانک چچی کی آواز آئی۔

''ارے بھئی کہاں کھوئی ہو۔ چلو تمہیں میکڈونلڈ سے کچھ کھلاتی ہوں۔ کیا کھاؤ گی؟''

بچوں کی طرح میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ اور فوراً فرمائش کر دی۔ ''فش فلے برگر اور چاکلیٹ شیک۔''

چچی نے ریستورانت کی کھڑکی کی طرف گاڑی روکی اور اندر سے آواز آئی۔ "May I Help You?" (کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں)

چچی نے انگریزی میں آرڈر بک کیا اور دوبارہ آواز آئی کہ فلاں کھڑکی پر گاڑی لے جائیں۔ ذرا سا آگے دوسری کھڑکی تھی وہاں گاڑی

کھڑی کی تو کھڑکی میں سے ہی ایک ویٹریس نے کھانا پکڑا دیا اور ہم چل دیے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا چاکلیٹ پنچ حلق سے نیچے اترتا گیا اور میری متلی ٹھیک ہوتی گئی۔

پاکستان سے چلتے وقت میں نے دادی کی ڈائری ساتھ رکھ لی تھی اور اس کو پڑھنے سے مجھے ان کی قربت کا احساس بھی رہتا تھا اور میرے بہت سے سوالوں کے جواب بھی مل جاتے تھے جو دادی گول کر جاتی تھیں۔ پاکستان میں تو پڑھائی کی وجہ سے پڑھ ہی نہ سکی۔ امریکا آ کر پڑھنی شروع کی ہے۔ سارا دن کی مصروفیت کے بعد رات کو سونے سے پہلے ضرور پڑھ لیتی ہوں اگر ڈائری نہ پڑھتی تو کیسے معلوم ہوتا کہ چچا فیروز امریکہ میں کیوں Settle ہو گئے۔ دادی نے لکھا ہے کہ:

''فیروز نے امریکا جانے کے بعد سے ہی ہم لوگوں سے دوبارہ رابطہ کیا اور اکثر خطوں میں مجھ سے معافیاں بھی مانگیں اور مجھے ٹکٹ بھیج کر امریکا بلایا بھی۔ اور چلی تو میں گئی مگر جو کچھ میں نے دیکھا اللہ مجھے بھی معاف کرے اور میرے بچوں کو بھی۔ اس ملک سے تو دور ہی بھلے وہاں کے لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ فیروز کے رہن سہن نے مجھے پندرہ بیس دن میں ہی واپس آنے پر مجبور کر دیا۔''

میں نے اپنی جگہ سوچا کہ مجھے تو یہ ملک بہت اچھا لگا۔ ایک تو سب لوگ خوشحال دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر لوگ ملنسار ہیں۔ بازار بہترین اشیاء

سے بھرے پڑے ہیں اور بڑے بڑے سٹوروں پر سے خریدی ہوئی چیز چھ ماہ بعد بھی واپس کرنے جاؤ تو خوشی رقم واپس کر کے لے لیتے ہیں۔ کوئی بھیک مانگنے والا سڑک پر نظر نہیں آتا۔ غلط جگہ سے سڑک کوئی نہیں پار کرتا۔ دکانوں پر مصنوعات نہایت قرینے سے لگائی ہوتی ہیں۔ بیچنے والے بھی وضعدار۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی قطار نہیں ٹوٹتی۔ ایسی منظم ٹریفک ہے کہ لگتا ہے سب ریموٹ کنٹرول ہو رہی ہے۔ کسی بھی جگہ ہارن سنائی نہیں دیتا۔ پلازوں میں دکانوں پر ہلکا ہلکا میوزک ضرور بج رہا ہوتا ہے۔ سب ٹھیک ہے لیکن سرِ عام جنسی جذبات کا اظہار میرے لیے تو ان سب اچھائیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ دادی کہتی تھیں۔ ''محنت کرنے والوں کے لیے امریکا میں ہر خوشی قدموں میں ہے مگر وہاں آخرت سنوارنی بہت مشکل ہے۔''

مجھے دادی کی یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ دادی مجھے بہت پیار کرتی تھیں اکثر کہا کرتیں۔ ''بیٹی اللہ نے تجھے جتنی عقل اور حسن دیا ہے تیرا نصیب بھی ایسا ہی اچھا کرے۔'' اور میں کہتی ''دادی! آخر جس نے مجھے بنایا ہے اس نے میرا نصیب بھی تو لکھ دیا ہو گا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ فوراً مجھے گلے لگا لیتیں اور بہت دیر تک میرے بالکل چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بالوں میں نرم نرم انگلیاں پھیرتی رہتیں! دادی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو ماہ گزر چکے ہیں لیکن مجھے تو لگتا ہے جیسے دو صدیوں سے ان کی محبت سے محروم ہوں۔ یہاں کی مصروفیت کے

باوجود ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت میرے سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب F.Sc فرسٹ ایئر کے امتحان سے میں فارغ ہوئی تو سوچا تھا اپنی نیندیں پوری کروں گی اور ایک دن مینہ پھپھو کا فون کوئٹہ سے آیا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دادی نے رونا شروع کر دیا اور کچھ اس طرح سے ان کی بات میرے کانوں میں پڑی۔ ''تم چاروں مجھے اپنی چار انگلیوں کی طرح عزیز ہو، آج یہ بات کی ہے آئندہ نہ کبھی سوچنا نہ زبان پر لانا۔'' پھپھو نے مزید کچھ کہا اور دادی یہ کہتی ہوئی فون پنچ پر سامنے پڑی ہوئی سیٹی پر گر پڑیں۔ ''مینہ بس کرو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔''

میں پریشان ہو کر تسلیاں دینے آگے بڑھی تو ان کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا اور بروقت علاج سے بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہو گیا اور ہلکا سا سٹروک بھی۔ لیکن میری چھٹیوں کے شب و روز دادی کی تیمارداری میں گزر گئے۔

اس واقعہ کے بعد دادی کی وہ کھلکھلاہٹ واپس نہیں آئی جسے دیکھ کر میں ہمیشہ کہتی تھی۔ ''دادی کیا یہ اتنی خوبصورتی سے جڑے ہوئے دانت آپ کے اصلی دانت ہیں۔'' اور وہ ہمیشہ جواب دیتیں۔

''ہاں! بیٹی اللہ کی مہربانی ہے۔'' اور میں جھلا کر کہتی۔ ''دادی ایک تو آپ ہر بات میں اللہ کو لے آتی ہیں۔''

بس پھر کیا تھا دادی نصیحتوں کے انبار لگا دیتیں۔ اس وقت تو بہانہ کر کے میں کھسکنے کی کرتی لیکن دادی کی باتیں جو بھی تھوڑی بہت یاد ہیں ہر لمحہ میرے ساتھ ہیں۔

میرے فرسٹ پروفیشن کے امتحان ہو رہے تھے اور نہ جانے دادی نے فون کر کے مینہ پھپھو کو کیوں بلایا اور ان کے آنے کے تیسرے دن ہی اچانک دادی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ نہ تو ڈاکٹر اور نہ ہی دعاؤں کی ضرورت پڑی اور میری پیاری دادی سوتے میں ہی Cardiac Arrest کی وجہ سے سب کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اب جو میں نے ان کی ڈائری پڑھی تو اصلی حقیقت سامنے آئی اور مجھے یاد آیا کہ جب پھپھو آئی تھیں وہ دادی کو اکثر الگ کمرے میں لے جا کر اللہ جانے کیا سناتی رہتی تھیں اور دادی کا موڈ کچھ گڑبڑ سا رہنے لگا تھا۔ امی صبح کالج چلی جاتیں اور ابو آفس لہٰذا پھپھو کے لیے میدان صاف تھا۔

ایک دن مجھے دادی نے رات گئے بلایا اور پاس بٹھا کر میرے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں پھر چوما اور اپنے تکیے کے نیچے سے ایک بے حد خوبصورت سونے کی بریسلٹ نکالی جس میں سفید اور ہرے نگینے آنکھوں کو چکا چوند کر رہے تھے۔ میری دائیں کلائی میں پہنا کر بولیں۔

''بیٹی آج سے یہ تمہارا ہے تمہارے دادا نے مجھے یہ شادی پر دیا تھا۔'' میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور بہت مشکل سے کہ

پائی۔

''دادی یہ تو بہت مہنگا ہوگا۔''

''ارے بھئی تجھ سے تو اچھا نہیں۔''

پھر بہت عرصے بعد میں نے ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر عجیب سا نور دیکھا مگر اگلے جملے نے تو مجھے چونکا ہی دیا۔ مجھے اپنے ساتھ لگا کر بولیں:

''بیٹی آج تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''ضرور دادی آپ حکم کریں مگر امتحانوں کے دنوں میں کچھ نہ کرنے کو کہنا۔'' قدرے خاموشی کے بعد تھوڑا سا گلا صاف کر کے وہ محتاط لہجے میں بولیں۔

''مومنہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے کبھی آنکھ بند کر کے کسی کے مشورے سے نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجے میں ساری زندگی محرومیوں اور مصلحتوں کا طوق تمہارے گلے میں پڑا رہے۔''

''دادی میں بالکل نہیں سمجھی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''بیٹی میرا مطلب ہے جس طرح امی ابو کے مشورے سے ہی سہی لیکن تم نے اپنی خواہش سے بھی ڈاکٹری کی لائن اپنائی ہے۔ اسی طرح باقی فیصلے بھی کرنا مجبوری خواہ کتنی بھی ہو اپنی فطرت اور خواہش کا بھی احترام کرنا۔''

''اوہو! دادی کوئی صاف سا وعدہ لیں اتنی فلسفیانہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

اور آتی بھی کیسے میں تو بریسلٹ کو دیکھنے میں محو تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کل ہی آمنہ شانزے اور ماہا کو دکھاؤں گی تو وہ کیا کہیں گی؟ لیکن کل کی خبر کس کو ہوئی۔ دوسرے دن جب دادی ناشتے پر نہ آئیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا کمرے میں جا کر دیکھوں تو سامنے سے ملازمہ روتے ہوئے آئی اور اس نے بتایا کہ جب وہ دادی کو ناشتے کا بتانے گئی تو وہ بے ہوش پڑی تھیں اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ میں اور پھپھو ان کے کمرے میں گئے اور میں تو خاموش نبض سے ہی سمجھ گئی کہ دوسرے حملے نے دادی کی جان لے لی تھی پھر بھی ہسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ رات کو دل بند ہو گیا تھا۔ مجھ پر تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ امی ابو بھی بہت پریشان ہوئے۔ ملتان سے منزہ پھپھو بھی آ گئیں۔ مینہ پھپھو ان کے گلے مل کر روتی جاتی تھیں اور کہے جا رہی تھیں۔ ''ہائے منزہ! کاش امی نے کچھ دن اور انتظار کر لیا ہوتا!''

❁❁❁

دوسرا باب

دادی کی جدائی اور پڑھائی کے بوجھ نے شاید میری صحت پر کچھ زیادہ ہی برا اثر ڈالا تھا کہ امی نے ایک دن یہ فیصلہ سنایا کہ میں اکیلی کچھ دنوں کے لیے چچا فیروز کے پاس امریکا چلی جاؤں۔ ابو نے کافی احتجاج کیا کہ ''اکیلی کراچی تک تو گئی نہیں امریکا کیسے جائے گی۔'' لیکن امی کی ایک ہی بات نے ابو کو قائل کر دیا کہ ''اتنی بڑی ہوگئی ہے اور زمانے کا کوئی ہوش نہیں اسے'' ..... خدا جانے مجھ سے پوچھے بغیر جو یہ فیصلہ کیا گیا تھا بقول دادی کے اہم تھا یا غیر اہم، اور مجھے بھی اس کے متعلق کچھ سوچنا چاہیے تھا یا نہیں؟ یہ سب دھیان تو اب امریکا میں آ کر ذہن کو تختے میں ڈال رہے ہیں۔

مجھے امریکا آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے ہوں گے کہ ایک دن چچا جان نے گھاس کاٹتے ہوئے مشین بند کی اور مجھے پاس بلایا اور ایک دم سے سوال کر ڈالا۔ ''مومنہ، مینہ کا بیٹا منصور کیا کرتا ہے۔''

''چچا اس نے کیا کرنا تھا؟ میٹرک یا ایف اے پاس ہے۔ شاید پھپھا جان کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔''

''احسن کا تو دماغ خراب ہے۔'' کہہ کر چچا نے مشین چلائی اور آن کی آن میں لان کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور میں نے ان کے سوال کی اور آخری جملے کی کڑی جہاں سے بھی ملانے کی کوشش کی ناکام

رہی۔ بات آئی گئی ہوگئی اور میں نے سوچا واپس جانے میں کچھ دن باقی رہ گئے ہیں دادی کی ڈائری ٹربو (Turbo) لگا کر امریکا میں ہی ساری پڑھ لینی چاہیے ورنہ پاکستان میں تو موٹی موٹی کتابیں میری راہ تک رہی ہوں گی۔

اگر میں ڈائری نہ پڑھتی تو مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ ابو دادی کے سگے بیٹے ہیں اور چچا فیروز، مینہ اور منزہ پھپھو دادی کی بڑی بہن کے بچے ہیں۔ دادی اور ابو کے برتاؤ یا باتوں سے مجھے تو یہ شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ میرے خیال میں تو دادی ان تینوں کو ابو پر ترجیح دے دیا کرتی تھیں یہ کہہ کر کہ وہ بڑے بہن بھائی ہیں۔

ایک جگہ دادی لکھتی ہیں:

''مینہ آئی ہوئی ہے اس کا دوسرا بچہ ہونے والا ہے۔ میری اپنی طبیعت کچھ خراب ہے۔ نہ جانے سب کچھ کیسے سنبھال سکوں گی۔ منصور چار سال کا ہو گیا ہے پر مینہ نے اسے بہت بدتمیز پالا ہے۔ احسن کے سالانہ امتحان ہیں۔ جس وجہ سے وہ منصور کو وقت نہیں دے سکتا اور نانا کو تو ظاہر ہے کوئی پرواہ نہیں بلکہ انہوں نے بھی منصور کو سر چڑھا لیا ہے۔ لے دے کر ساری ذمہ داری مجھ پر ہی پڑتی ہے اللہ ہی مجھے ہمت دے کہ شنو آپا سے کیا ہوا وعدہ میں پورا کر سکوں اور ان کے بچوں کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دوں۔''

اس کے بعد دادی نے مینہ پھپھو کی حرکتیں اور ان کے ساتھ گزرا ہوا زمانہ قلم بند کیا ہوا تھا وہ میں نے سرسری سا پڑھا۔ آگے لکھتی ہیں:

''مینہ سے مجھے ایک خاص انسیت محسوس ہوتی ہے شاید اس لیے کہ اس کی شکل شنو آپا سے بہت ملتی ہے اور اس کا دل دکھے یا کوئی اونچ نیچ اس کے ساتھ ہو جائے تو باقی بچوں کی نسبت مجھے زیادہ رنج ہوتا ہے لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ نالاں ہی رہی اور حامد سے شادی کر کے تو میرے سینے میں ایک مستقل گھاؤ لگا دیا ہے۔ حامد مینہ کی سہیلی صولت کا بھائی ہے۔ ٹانگے پہ سب لڑکیاں اکٹھی اسکول جایا کرتی تھیں۔ ایک دن اس نے دیکھ لیا اور فدا ہو گیا اور گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیج بھیج کر عاجز کر دیا۔ میری خواہش تھی کہ مینہ کم از کم بی اے کر لیتی اور جب مینہ نے دیکھا کہ میں بی اے سے پہلے اس کی شادی پر کسی طرح بھی راضی نہیں ہوں گی تو ایک دن مجھ پر تقریباً برس ہی پڑی۔ میرے تو ہوش جاتے رہے۔ کہ خدایا جن بچوں کو میں نے اپنی ہمت، عمر اور عقل کا نچوڑ دے کر پالا ہے یہ اٹھ کر اس طرح میرے سامنے بولنے لگے۔ آج بھی سوچوں تو دل بھر آتا ہے جب مینہ نے کہا۔

''امی آپ ہماری ماں تو نہیں ہیں نا؟ کہ ہمارے برے بھلے کی آپ کو پہچان ہو یا ہمارے نفع نقصان کا خیال ہو۔ مائیں بیٹیوں کے گھر بسانا چاہتی ہیں اور آپ ہیں کہ گھر آئے رشتے کو دھتکار رہی ہیں۔'' ..... مجھے مجبوراً راضی ہونا پڑا اور اس کی شادی ہو گئی۔ کاش اس نے مجھے ماں نہ سہی

اپنا ہمدرد سمجھ کر یہ حرکت نہ کی ہوتی۔ اسے کیا بتاؤں کہ میرے دل کا حال کیا ہوتا ہے جب حامد اس کا بناؤ سنگھار دیکھ کر سب کے سامنے اس کی بے عزتی کر دیتا ہے یہ کہہ کر کہ مینہ نے کسی اور کو ریجھانے کے لیے سنگھار کیا ہے اور وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ اگر اجڑی پجڑی رہے تو کہتا ہے کہ ''میں کیا مر گیا ہوں کہ بیواؤں کا سا حال بنا رکھا ہے۔ آخر وہ بے چاری کیا کرے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ جب تک یہاں تھے میرے لیے صبح و شام کا رونا تھا۔ مینہ کو دیکھ دیکھ کر۔ اب سارا کاروبار سمیٹ کر کوئٹہ چلا گیا ہے۔ نہ خود آتا ہے نہ اس کو آنے دیتا ہے۔ سال کے سال بقر عید پر اپنے والدین کے پاس آتا ہے اور مینہ مشکل سے ایک دن ہمارے پاس گزارتی ہے۔ بہت خاموش اور گھبرائی گھبرائی سی شخصیت بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کچھ کہوں تو کہتی ہے۔

''امی گیا وقت تو ہاتھ نہیں آتا۔'' اور یہ جملہ میرے لیے اور بھی سوہان روح ہوتا ہے۔

بھلا اس دن کے لیے میں نے ان بچوں کو پیار سے پالا تھا سوائے افسوس کے اور میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ یوں تو میری شادی کے بعد سے ہی دونوں بڑے بچے جو کہ ماں کے بعد مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے اور میرا کہا مانتے تھے نہ جانے اپنے گھر میں مجھے دیکھ کر اجنبی سے بنتے جا رہے تھے۔ حالانکہ شروع شروع میں بہت خوش تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم میں

جو اعتماد تھا وہ دن بدن دھندلاتا جا رہا تھا اور فیروز تو میری منتوں کے باوجود لڑ جھگڑ کر ہاسٹل چلا گیا تھا۔ شکر ہے ان نے F.Sc اچھے نمبروں میں پاس کر لی ورنہ شاید اپنے آپ کو میں کبھی نہ بخشتی۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تھا اکھڑا اکھڑا ہی رہتا تھا۔ البتہ احسن سے بہت دوستی تھی۔ اس کی پڑھائی اور کھیلوں میں کافی دلچسپی لیتا تھا۔ اس طرزِ زندگی کی عادت سی ہو چلی تھی۔

فیروز کے میڈیکل کالج کے دو سال ہی گزرے تھے کہ وہ چھٹیوں میں گھر نہ آیا اور اس کا خط بڑی معذرتوں اور معافیوں کے ساتھ امریکا سے آیا کہ وہ بن بتائے اس لیے امریکا گیا کہ ڈر کے مارے ابو کو نہ بتا سکا اور امی کو اس لیے نہیں بتایا کہ وہ رنجیدہ ہو جاتیں، بھلا اب کون سا ہم نے مٹھائی بانٹنی تھی۔ گھر میں کہرام تو مچ ہی گیا لے دے کے سارا الزام میرے سر تھا کہ مجھ سے تنگ آ کر بھاگا ہے۔ شکر ہے احسن نے باپ کا غصہ ٹھنڈا کیا یہ کہہ کر کہ وہاں کی پڑھائی کے بعد اپنے ملک میں نوکری اچھی ملتی ہے۔

میرے دل کا حال تو میں یا میرا خدا ہی جانتا ہے کہ اپنے آپ کو میں اللہ کے سامنے اور اپنی بہن کی روح کے سامنے کتنا ذلیل سمجھ رہی تھی۔ بار بار سوچتی کہ ضرور میری پرورش میں ہی کوئی کمی رہ گئی۔ اگر تھی تو وجہ صرف میری کم عمری ہو سکتی تھی۔ ورنہ شادی کے دن سے ہی بیس سال بڑے خاوند کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے خود کو اپنی عمر سے کم از کم دس سال تو بڑا محسوس کر ہی رہی تھی اور اپنے مستقبل کے متعلق دیکھے ہوئے خواب اور اعلیٰ

تعلیم حاصل کرنے کا ارمان بہن اور ان بچوں کی خاطر میکے میں ہی دفن کر آئی تھی ایک جگہ دادی نے لکھا کہ شنو آپا کے مرنے کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگیں اور انہوں نے ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ لکھتے لکھتے وہ اپنی عمر کے ابتدائی دور تک لکھنا شروع ہو گئیں۔ لکھتی ہیں:

میری پیدائش سے بھی پہلے میری دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور علی بھائی اور اقبال بھائی بھی چھوٹی عمر میں ہمارا گاؤں سبارٹھو چھوڑ کر دہلی چلے گئے تھے۔ پہلے وہاں لوگوں کی نوکریاں کیں اور پھر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ دہلی میں زیادہ تر مسلمانوں کا کپڑے کا کاروبار تھا اور پڑھے لکھے مسلمان دفتروں میں کام کرتے تھے وہاں اماں اور ابا کی عزیز داری بھی کافی تھی۔ اس لیے شادیاں بھی وہیں کر کے خوشحال زندگیاں گزار رہے تھے۔ سبارٹھو میں تو پیٹ بھر کر کھانا اور تن پہ ضروری کپڑے کا ہونا ہی بڑی عیاشی تھی۔

سبارٹھو شملے سے آگے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ صرف ایک پرائمری اسکول تھا جس پر اجارہ داری ہندوؤں کی تھی۔ ابا پانچ جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ مسلمان برادری میں ابا کی کافی عزت تھی اکثر شملے آتے جاتے رہتے تھے تھوڑی بہت انگلش بول لیتے تھے۔ گرمیوں میں حکومت برطانیہ کے دفتر شملے آتے تو ابا کو چھوٹے موٹے کام کافی مل جاتے تھے۔ باقی مسلمانوں سے ہمارا گھر نسبتاً خوشحال تھا۔

جب میں پانچ سال کی تھی تو بڑی آپا کے میاں کو جو کہ شملے میں رہتے تھے کسی انگریز نے لاہور ایچی سن کالج کے دفتر میں نوکری دلا دی اور کچھ ہی عرصے بعد ہم بھی ابا کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ چند دن ہم لوگ بڑی آپا کے پاس رہے۔ پھر ابا کو شہر کے بہت بڑے ہوٹل فلیٹیز میں نوکری مل گئی۔ شنو آپا اور میں کینڈا اسکول میں داخل ہو گئے ..... لاہور میں اسکول جب ٹانگے پر جانا پڑا تو میں سمجھی کہ لاہور شاید دنیا کا سب سے بڑا شہر ہوگا۔ نتھو لالا کا ٹانگہ بھی کیا چیز تھا۔ لگتا تھا ہوا میں اڑے جا رہے ہیں۔ سیدھی سیدھی ہموار سڑکیں پہاڑی پگڈنڈیوں کے بعد عجیب ہی لگتی تھیں..... سبار ٹھو میں اگر کہیں دور جانا ہوتا تو ڈانڈی پر جانا پڑتا جس میں مشکل سے دو بندوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی اور چار بندے اسے کاندھوں پر اٹھا کر اونچے نیچے راستوں پر بھاگتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔ میں تو گرنے کے ڈر سے روتی ہی رہتی۔ لیکن ابا بتاتے تھے کہ شملے میں ایک بندہ دو پہیوں کی سواری کھینچتا ہے اور یہ کہ وہاں سڑکیں بھی پکی ہیں..... مگر لاہور کی سڑکوں کی کیا بات ہے..... میں لاہور میں بہت خوش تھی۔ ابا ہم دونوں بہنوں کو روزانہ گول گپے کھانے کے لیے ایک پیسہ دیتے تھے۔ خوب پیٹ بھر جاتا تھا مائی نوراں بناتی بھی بہت اچھے تھی۔

آنکھ جھپکتے میں پانچ سال گزر گئے اور شنو آپا نے میٹرک پاس کر لیا۔ خاندان میں پہلی لڑکی نے میٹرک کیا۔ ابا نے آپا کو ایک چاندی کا روپیہ

انعام دیا۔ میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور جب آپا نے ان پیسوں سے دو مارکین کے سوٹ اور ایک عدد لفٹی ہیل کا سینڈل اور چھبی کی ململ کے دوپٹے لیے تو میں رشک ہی کرتی رہ گئی۔ ہفتے کے اندر ہی موچی دروازے سے زبیدہ خالہ اور گوال منڈی سے حمیدہ خالہ آئیں تو اور بھی شنو آپا کے مزے ہو گئے دونوں امرتسری مٹھائی کی ٹوکریاں اور ساتھ میں ایک ایک کپڑوں کا جوڑا بھی لائیں۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ آنے جانے لگیں اور اماں کو شنو آپا کی شادی پر مجبور کرنے لگیں۔ ایک کا بیٹا کلرک تھا اور دوسرا کسی ہندو کی دکان پر ملازم تھا۔ اماں اور ابا سوچ ہی رہے تھے کہ کیا فیصلہ کیا جائے کہ ایک دن ابا کی کوئی دور دراز کی رشتہ دار سیالکوٹ سے ملنے آئیں اور دو دن ہمارے ہاں رہیں۔ غالباً وہ شنو آپا پر فدا ہو گئیں اور ان کے جانے کے ہفتے بعد آپا کا رشتہ طے ہو گیا ہے کسی پڑھے لکھے انسان سے جو دنیا میں اکیلا ہے۔ کچی ہی سہی پر گورنمنٹ کی نوکری کرتا ہے۔ انگریز افسر کا منظورِ نظر ہے۔ لڑکی عیش کرے گی۔

میری تو خوشی کا ٹھکانہ تھا کہ شادی ہونے والی تھی۔ مگر شنو آپا یہی کہتی تھیں کہ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھیں۔ خیر ان کی کس نے سننی تھی۔ ایک دن تو ابا ٹانگے کی اگلی پچھلی سیٹیں پہننے کے کپڑوں سے اور زمین پر بچھانے کی دریوں سے اور بستر کی چادروں اور دریوں سے بھر لائے۔ اماں کے آگے لا کر ڈھیر کر دیا بولے۔

''اصغر میاں نے کہا ہے کوئی کسر نہ چھوڑنا اور یہ سب کچھ میں پورے چھتیس روپے میں لایا ہوں۔ انہوں نے پورے سو روپے دیے ہیں زیور کے الگ دیں گے۔''

ہونے والے اصغر بھیا کا شاید آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے ابا سے خریداری کروا رہے تھے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن وہ میری شنو آپا کو لینے آ گئے۔ اماں نے مجھے حفیظن کی منت سماجت کر کے پٹہ پٹی کا غرارہ بنوا کر دیا اور دوپٹے اور غرارے کی گوٹ پر گوکھرو کی ایک ایک دھنک لگوا دی مجھے تو لگا میرے پاؤں زمین کی بجائے آسمان پر پڑ رہے تھے۔ کیونکہ میں ابھی برقعہ نہیں اوڑھتی تھی بارات آنے کی بھنک پڑتے ہی مردانے میں بھاگی۔ ہمارے کوارٹر میں کمروں کے باہر ایک برآمدہ تھا اور پھر صحن۔ مردوں کے بیٹھنے کے لیے وہاں بندوبست تھا۔ ابا نے ہوٹل والوں سے چند کرسیاں لے لی تھیں۔ اور تخت تو برآمدے میں رکھا ہی رہتا تھا۔ خیر بڑی مشکل سے غرارہ اور دوپٹہ سنبھالتے ہوئے میں مردانے میں بھاگی اور ایک بہت لمبے چوڑے دولہا کو دیکھ کر دنگ سی رہ گئی۔ مجھے تو کوئی ولائتی جن لگ رہا تھا گورا رنگ، کالی مونچھیں، تن پر پینٹ اور کوٹ اور سر پر کلے والا شملا۔ مجھے دیکھتے ہی گود میں بٹھایا اور بولے۔

''آج ہم تمہاری آپا کو لے جائیں گے۔'' ایک حسد اور نفرت کا

غبار سا میرے سینے میں اٹھا اور میں جلدی سے ان کی گود سے نکل کر شنو آپا کے پاس بھاگی۔ عنابی مخمل کے سوٹ پر سنہری کام ماتھے پر کندن کا دونی ٹیکہ، گلے میں رانی ہار، کانوں میں کرن پھول اور دونوں ہاتھوں میں پنج اونگلے۔ میری پریوں سے بھی حسین آپا گاجری بنارسی دوپٹے میں لپٹی لپٹائی کالا برقعہ اوڑھے ہم سب کو روتا چھوڑ کر اصغر بھائی کی گاڑی میں بیٹھیں اور یہ جا وہ جا۔ اماں نے ابا سے بہت کہا کہ حفیظن کو ساتھ بھیج دیں مگر وہ نہ مانے۔ اگلے دن جب ہم آپا کو لینے گئے تو اصغر بھائی کے کچھ دوستوں کی بیویاں اور ان کی بچیاں شنو آپا کو گھیرا ڈالے بیٹھیں تھیں اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی جا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی سب وہاں سے چھٹ گئے اور آپا نے جو گردن اٹھا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے پرستان سے کوئی شہزادی پستئی رنگ کا چائنہ پتی کا غرارہ اطلس کی قمیص اور گاج کا دوپٹہ اوڑھے زمین پر اتر آئی ہو۔ کانوں میں زمرد کے مگر اور گلے میں پنے کا ہلکا سا ہار۔ میں نے سوچا اگر اصغر بھائی آپا کے آس پاس نہ ہوں تو ٹھیک۔ میں آپا کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ اچانک ان کی کلائی پر نظر پڑی تو میں دنگ رہ گئی اور ایک سانس میں ہی آپا سے پوچھ بیٹھی۔

''ہائے! آپا یہ بریسلٹ تو ابا نے نہیں خریدی تھی۔ یہ کہاں سے آئی۔''

''یہ تمہارے اصغر بھائی نے منہ دکھائی میں دی ہے۔''

بہت ہی خوب صورت بریسلٹ جس میں پکھراج اور پنے کی جڑت تھی۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آپا کی مرمریں گول کلائی بریسلٹ کو نکھار رہی تھی یا بریسلٹ آپا کی کلائی پہ سج رہی تھی۔

بڑی آپائیں آپس میں بھی اور شنو آپا سے بھی نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتی رہیں اور کچھ ہی دیر بعد ہمیں دوسرے کمرے میں بلایا گیا جہاں دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ باقی خواتین بھی شامل ہوگئیں اور یوں آپا کا ولیمہ ہوگیا۔

دو ماہ بعد اصغر بھائی کی تبدیلی پٹھان کوٹ ہوگئی اور میری شنو آپا مجھ سے بہت دور چلی گئیں۔

دس ماہ بعد شنو آپا گھر آئیں تو ان کا برا حال تھا۔ رنگ پیلا، چہرہ مرجھایا ہوا۔ اماں کے کریدنے پر یہی کہتیں۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہے۔'' ..... میں اپنی جگہ سوچتی ٹھیک ہی تو ہے نئے سے نئے کپڑے پہنتی ہیں سونے کی نئی چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں اور میرے لیے بھی تو چھینٹ کے سوٹ لائی تھیں روزانہ مجھے اسکول جاتے وقت دو پیسے دیتی تھیں۔ میری سہیلیاں کہتیں کون سا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں تو ان کو دیکھ کر بہت خوشی تھی اور ان کے آنے کے دو ہفتے بعد ان کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے ایک لڑکا ایک لڑکی۔ چھ ماہ تک وہ ہمارے ہاں ہی رہیں۔ اصغر بھائی دو دفعہ آئے ایک بچوں کا عقیقہ کرنے اور دوبارہ جب آپا کو ساتھ لے جانا تھا۔ آپا

کی صحت بھی ٹھیک ہوگئی تھی اور بچوں نے بھی جان پکڑ لی تھی۔ مگر اس دوران اماں کے ہوش اڑ گئے تھے اور مجھے بھی روزانہ اسکول میں ڈانٹ پڑتی تھی یا تو ہوم ورک نہ کرنے پر اور یا اسکول دیر سے پہنچنے پر۔ مگر میری پیاری شنو آپا کی خاطر مجھے سب کچھ منظور تھا۔

تیسرا باب

ایک دن ٹیرس پر ہم تینوں چائے پی رہے تھے کہ موسم خراب ہونا شروع ہو گیا۔ جیسے پاکستان میں برسات کے موسم میں اچانک کالے بادل آ جاتے ہیں اور گرج چمک کے ساتھ بارش ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں تو گرمی کی شدت میں کمی ہونے کی وجہ سے گھر گھر پکوڑے، فرنچ توس اور اس قسم کی چیزوں کے دور چلتے ہیں مگر امریکا میں اس دن میں نے عجیب ہی تماشا دیکھا۔ جیسے ہی موسم نے رخ بدلا چچا اندر بھاگے اور ٹی وی لگا دیا اور چچی بھی یہ کہہ کر چلی گئیں کہ۔

''موسم کی وارننگ آ رہی ہے۔''

''چچی موسم تو بہت اچھا ہے وارننگ کیسی آ رہی ہے۔''

''مومنہ میڈیا پلس میں ٹارنیڈو (Tornado) بہت آتے ہیں اس لیے ہشیار رہنا پڑتا ہے۔''

اندر سے چچا کی آواز آئی۔

''مومنہ اندر آ جاؤ ہماری کاؤنٹی کی طرف ہی ٹارنیڈو آ رہا ہے۔'' ہم دونوں اندر بھاگے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹی وی پر بھی ہر پروگرام کے نیچے لکھا ہوا آ رہا تھا کہ ٹارنیڈو فلاں فلاں جگہ سے گزر رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ Heny Pen County کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''چچی جان یہ ٹارنیڈو آخر کیا بلا ہے؟ جس کا اتنا نقارہ بج رہا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ زمین سے بخارات اکٹھے ہو کر کچھ اس طرح کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ ایک بگولا سا بن جاتے ہیں اور کچھ اس طرح کا لگتا ہے جیسے الہ دین کے چراغ میں سے جن نکلتا کہانیوں میں دکھاتے ہیں۔ وہ بگولا زمین سے شروع ہو کر اپنا دائرہ بڑھاتا جاتا ہے اور ایک گونج کے ساتھ کسی رخ بھی نکل جاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اوپر کا سرا اس کا آسمان کو چھو رہا ہے۔ اونچائی کی طرف اس کا دائرہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ راستے میں جو چیز آ جائے اسے وہ اکھیڑ کر ہوا میں بکھیر دیتا ہے۔''

''چچی آخر اس کے راستے میں کیا ہو سکتا ہے جسے وہ اکھیڑے گا۔''

''ارے بیٹی وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً گاڑی، ٹرک، یا کوئی بلڈنگ یا مکان کچھ بھی ہو تہس نہس کر دیتا ہے۔''

''ہائے اللہ پھر تو کافی خطرناک چیز ہے۔''

''ہاں بھئی یونہی تو نہیں گورنمنٹ اتنی وارننگ دے رہی۔''

دو گھنٹے تو ماحول میں عجیب کھچاؤ سا رہا شکر ہے بگولے نے اپنا رخ بدل لیا اور جس جگہ ہم رہ رہے تھے وہاں سے پچاسی میل دور سے اس نے اپنی تباہ کاریاں شروع کیں یہ اچھا ہوا کہ وہاں آبادی نہیں تھی۔ ایک ہیلی کاپٹر اس کے جتنا قریب بھی جا سکتا تھا برابر ٹی وی پر اس کا منظر دکھاتا رہا۔ شکر ہے جس

جگہ سے بگولا گزر رہا تھا وہاں آبادی تو نہیں تھی مگر جنگل کے درخت اس طرح فضا میں اڑ رہے تھے جیسے ماچس کی تیلیاں کسی نے بکھیر دی ہوں میں نے پوچھا۔ ''چچا اگر یہ آبادی کی طرف سے گزرے تو کیا کرتے ہیں۔''

''بیٹی ان لوگوں نے بہت اچھے بندوبست کیے ہوئے ہیں اگر اس کے راستے میں کوئی آبادی آجائے تو وہاں ایک دم سائرن بجنے شروع ہو جاتے ہیں اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لوگ تہہ خانوں میں چلے جاتے ہیں۔ شاپنگ پلازوں میں بھی بڑے بڑے (Shelter) شیلٹر بنے ہوئے ہیں۔ سب مخلوق خطرہ ٹلنے تک وہیں رہتی ہے اور اگر کوئی قسمت کا مارا اس کے شکنجے میں آجائے تو بس سمجھو اس کی شامت آئی۔''

''اللہ کرے میرے ہوتے ہوئے تو نہ ہی اس طرف آئے مجھے ایسی چیزوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

جب ٹی وی پر انہوں نے بتایا کہ اب کوئی خطرہ نہیں تو مجھے سکون آیا۔ اب چچی اور چچا کوئی فلم دیکھنے لگ گئے لہٰذا میں سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور دادی کی ڈائری کھولی لکھا تھا۔ ''شنو آپا کبھی کبھار خط لکھ دیتی تھیں مگر مجھے حکم تھا کہ پندرہ دن میں ایک خط ضرور لکھوں اور اس دفعہ جو گئیں تو کافی عرصہ نہ آسکیں شاید بچوں کی وجہ سے اور اصغر بھائی نوکری کے سلسلے میں جگہ جگہ تبدیل بھی تو ہوتے رہتے تھے۔ میں نویں میں تھی تو پتا چلا کہ آپا کے تیسرے بچے کی آمد ہے۔ کیونکہ ان دنوں وہ بنگال میں تھے نہ وہ آسکیں اور نہ

یہاں سے کوئی گیا۔ مگر قیامت یہ ٹوٹی کہ ابا کو ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سب بہن بھائی آئے سوا آپا کے۔ علی بھائی اور اقبال بھائی نے بہت اصرار کیا کہ اماں اور میں ان کے ساتھ دہلی چلے جائیں مگر اماں نہ مانیں اور فیصلہ ہوا کہ ہم دونوں لاہور میں بڑی آپا کے پاس رہیں گے۔ کہتے ہیں مصیبت اکیلی نہیں آتی اور دو ماہ بعد اماں بھی تھوڑی سی علالت کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس وقت بھی شنو آپا نہ آسکیں۔ شاید اکیلے اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ اصغر بھائی ان دنوں مارٹن صاحب کے ساتھ شیر کے شکار میں مصروف تھے۔ میں اکثر سوچتی کہ جو بھی عذر وہ کر رہی تھیں حقیقت تھی یا بہانہ۔ اماں کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ تو کسی طور بھی پر نہیں ہو سکتا تھا۔ پر بڑی آپا کی بیٹی خوشنودہ میری ہم عمر تھی۔ جس نے میرا غم کافی ہلکا کرنے میں میری مدد کی۔ میں ان کے ماحول میں جلد ہی گھل مل گئی۔ آپا اور سرور بھائی بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی رکھتے تھے۔ خوشنودہ بھی کینیڈا اسکول میں پڑھتی تھی اور اب میں اس کے ساتھ بس میں اسکول جاتی تھی۔ سرور بھائی آفس سے آنے کے بعد سٹاف کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ اچھا خوشحال گھرانہ تھا۔

ایک دن میں اور خوشنودہ بس سے اتر کر گھر آرہے تھے کہ کالج کے مندر کے پاس درختوں پر پکے پکے جامنوں پر نظر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا کتابیں رکھیں نہر کے پل پر اور نقاب الٹ کر برقعے کے کونے میں ہی جامن جمع

کرنے شروع ہوگئیں۔ کھاتے بھی جاتے اور جمع بھی کرتے جاتے ہمیں شاید وقت کا احساس ہی نہ رہا اور غالباً وقت کچھ زیادہ ہی گزر گیا۔ روزانہ جب ہم اسکول سے آتے تھے تو یہ جگہ سنسان ہی ہوتی تھی اس دن اچانک لڑکوں کے غول کے غول اس طرف آنے شروع ہو گئے۔ ہم دونوں نے گھبرا کر جامن وہیں پھینکے اور کتابوں کا ہوش ہی نہ رہا سٹ پٹاتے سیدھے گھر بھاگے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ وقت لڑکوں کا مسجد اور مندر جانے کا تھا۔

شام کو بھائی جان سے خوب ڈانٹ پڑی۔ جب بھوندو نے آ کر کتابیں دیں۔ بھوندو کو کسی لڑکے نے دی تھیں کیونکہ میری کتاب میں شنو آپا کا خط تھا اور اس پر بھائی جان کا پتا لکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں بہت ہی شرمندہ ہوئیں۔ خوشنودہ اور میں نے محسوس کیا کہ اکثر ہمارے گھر کی طرف سے سائیکلوں پر دو لڑکے روزانہ شام کو گزرنے لگے ہیں یا شاید پہلے بھی جاتے ہوں گے ہم نے غور نہیں کیا ہوگا۔

سرور بھائی کا گھر چار کمروں اور ایک عدد صحن پر مشتمل تھا جو کہ مجھے بہت ہی کشادہ لگتا تھا کہاں فلیٹیز کے دو کمرے اور کہاں یہ پورا گھر سامنے اور پیچھے لان بھی تھے۔ ایجیسن کالج شہر سے تو بہت دور تھا لیکن جگہ بہت اچھی تھی۔ جگہ جگہ بڑے بڑے درخت اور کھیت صاف ستھری سڑکیں، بہت بڑے بڑے کھیلنے کے میدان اور گھوڑوں کے اصطبل۔ کیونکہ راجوں مہاراجوں کے لڑکے پڑھتے تھے ان کے لیے ہر چیز بہترین مہیا کی گئی تھی۔ لڑکوں کے

نوکروں کے کوارٹر، کریانہ، سبزی اور گوشت کی دکانیں، درزی، دھوبی گھاٹ، گویا ہر ضرورت پوری کرنے کا بندوبست ایک چھوٹی سی بستی میں موجود تھا۔ مغرب کے وقت خواتین کالج کے تالاب میں نہانے جاتی تھیں۔ اچھا شغل رہتا تھا۔ یہاں جو لڑکے پڑھنے آتے تھے ان کے ٹھاٹھ باٹ ہی کچھ اور تھے۔ کبھی کبھی نہ جانے کیوں میرے دل میں امنگ اٹھتی کہ کاش میری قسمت میں بھی کوئی ایسا ہی شہزادہ لکھا ہو جس کی شکل اور عقل کو دولت نے چار چاند لگا دیے ہوں۔

وقت گزرتا رہا۔ مجھے میٹرک کے رزلٹ کا انتظار تھا کہ پتا چلا آپا اور اصغر بھائی آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے اماں اور ابا کا غم تازہ ہو گیا۔ دونوں بچے کافی بڑے بڑے لگ رہے تھے مگر تھوڑی ہی دیر میں مانوس ہو گئے۔ چھوٹی کو تو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ شنو آپا مرجھائی سی لگ رہی تھیں۔ سوچا سفر کی تھکان ہو گی لیکن اگلے دن پتا چلا کہ تقریباً ایک سال سے بہت بیمار رہنے لگی تھیں اور اب اصغر بھائی میو ہسپتال میں ان کا علاج کروانے آئے ہیں۔ سب ٹیسٹ وغیرہ ہوئے اور ڈاکٹر نے یہی شبہ ظاہر کیا کہ شاید آپا کو ٹی بی ہے کسولی کے سینیٹوریم لے جائیں مگر ایک تو اصغر بھائی کی چھٹی ختم ہو چکی تھی دوسرے وہ کہنے لگے۔

''شنو کو یہ بیماری نہیں ہو سکتی۔ دنیا جہاں کی خوشی اور نعمتیں اس کو میسر ہیں۔''

آپا اور بچوں کو چھوڑ کر وہ بنگال چلے گئے۔ آپا کی صحت دن بدن خراب ہی ہوتی رہی اور چند ماہ بعد پتا چلا کہ اصغر بھائی کی تبدیلی چمن ہوگئی ہے جو کہ ایران کے بارڈر کے پاس ہے۔ کوئٹہ سے بھی آگے۔ اصغر بھائی آئے اور آپا اور بچوں کو لے گئے۔ بولے کوئٹہ میں کسی ڈاکٹر سے آپا کا علاج کروالیں گے۔ میں نے اور خوشنودہ نے کینڈ کالج میں داخلہ لے لیا اور پڑھائی میں مصروف ہوگئیں۔ شنو آپا حال سے بے حال ہو کر چھٹے ساتویں مہینے آجاتیں۔ جب ذرا صحت سنبھل جاتی تو اصغر بھائی آ کر لے جاتے۔ زہر لگتے تھے مجھے۔ میری آپا کا کیا حال کر دیا تھا۔ اسی طرح دو سال اور گزر گئے اور خوشنودہ اور میں نے ایف اے پاس کر لیا۔ جب پتا چلا کہ شنو آپا آ رہی ہیں تو سوچا ضرور میرے پاس ہونے کی خوشی میں آ رہی ہوں گی۔ دن میں بھی خواب دیکھتی تھی کہ خدا کرے اب آپا پہلی جیسی چمبیلی کی طرح نازک اور گلاب جیسی تازہ اور شگفتہ ہوں۔ آخر ان کی آمد کا دن بھی آ گیا۔ میں دروازے پر بے تابی سے انتظار کر رہی تھی کہ جیسے ہی آپا اندر آئیں گی انہیں خوب لپٹ کر گلے ملوں گی۔ مگر جب ٹانگے سے اترتے وقت اصغر بھائی نے انہیں سہارا دیا اور پکڑ کر اندر لائے تو میری خوشی دھری کی دھری رہ گئی۔ ہائے! میری آپا اس دفعہ تو بہت ہی کمزور اور بیمار لگ رہی تھیں۔ تیسرے دن اصغر بھائی نے الگ کمرے میں بڑی آپا سے نہ جانے کیا لمبی بات کی اور جاتے جاتے یہ کہ گئے کہ:

''آپا میری نوکری کا مسئلہ ہے ویسے میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔'' اور بچوں اور آپا کو چھوڑ کر وہ چلے گئے۔

سارا دن میں بچوں کی ضروریات بھی پوری کرتی اور بچہ بن کر ان کے ساتھ کھیلتی بھی۔ بڑی آپا کے چھوٹے بچے پڑھائی میں مصروف تھے اور خوشنودہ امتحانوں کے بعد اپنے چچا کے پاس ملتان گئی ہوئی تھی۔ بچوں سے مجھے جو وقت فالتو ملتا میں آپا کا دل بہلانے کی کوشش کرتی مگر وہ میری ساری محنت پر پانی پھیر دیتیں یہ کہہ کر کہ ''خانم میرے بعد میرے بچوں کا خیال رکھنا۔'' ایک دن تو میرے منہ سے نکل گیا۔

''میری شنو آپا کیا اس دفعہ میرے پاس بچوں کو چھوڑ کر اکیلے ہی گھر جانے کا ارادہ ہے؟''

مگر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات ٹال گئیں۔ اسی طرح دو ماہ گزر گئے اور کالج کے داخلے شروع ہو گئے۔ میں نے پختہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ میں بے۔ اے، بی۔ ٹی کر کے کسی اسکول میں پڑھاؤں گی اور اپنی بہنوں کی طرح شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑوں گی لیکن اصغر بھائی کے ایک ہی خط نے میرے ارادوں کا محل ڈھیر کر دیا۔ لکھا تھا کہ شاید وہ کافی عرصہ نہ آ سکیں گے اس لیے فیروز اور مینہ کو لاہور ہی کسی اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ ساتھ سو روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیے۔ جس دن خوشنودہ داخلہ کے لیے کالج جا رہی تھی مجھے فیصلہ سنایا گیا کہ شنو آپا کے صحت یاب ہونے تک مجھے

پڑھائی ملتوی کرنی پڑے گی۔ اس وقت تو مجھے یوں لگا کہ مجھے کسی نے کوہ ہمالیہ سے نیچے لڑھکا دیا ہو۔ ذرا ہوش ٹھکانے لگے تو سوچا کہ واقعی میری جان سے پیاری شنو آپا کو میری ضرورت تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا آپا کی طبیعت خراب ہی ہوتی گئی۔ کسی کسی دن بخار بھی ہو جاتا اور تھوڑی سی کھانسی بھی رہنے لگی۔ بڑی آپا نے ڈاکٹر کے ساتھ حکیم کا علاج بھی شروع کرا دیا مگر مرض کسی کے قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ روزانہ کالج کے بارے میں خوشنودہ سے میں پوچھتی اور سوچتی اگلے سال تک تو آپا گھر جا ہی چکی ہوں گی میں بھی داخلہ لے لوں گی۔ لیکن سال تو کیا انسان کے بس میں شاید آنے والا ایک پل بھی نہیں۔

جمعہ کی رات تھی اور حسب معمول بچوں کو سلا کر ان کی دن بھر کی باتیں اور حرکتیں آپا کو سنا رہی تھی کہ آپا نے مجھے اچانک ہی ایک عجیب انداز سے گھورنا شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد زار و قطار رونے لگ پڑیں۔ میں نے ان کی رخصتی کے وقت انہیں روتے دیکھا تھا۔ دمکتے گالوں پر آنسو چاندی کے موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے یاد تھے اور اس رات یوں لگا جیسے کسی ویران باغ میں موسلا دھار بارش پڑ کر اسے اور ویران کیے دے رہی ہو۔ جب میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو کچھ بولے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے بھینچنا شروع کر دیا۔ اتنے میں کھانسی شروع ہو گئی۔ بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ بڑی آپا کمرے سے آ گئیں اور بولیں۔

''شنو ہر غریب اور امیر پر بیماری تو آتی ہی ہے تو بھلا کیوں اتنا گھبرا گئی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔''

بڑی آپا نے بڑے پیار سے شنو آپا کا سر دبایا اور پانی لینے باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ شنو آپا نے نظر مجھ پر ڈالی اور کوشش کر کے کھانستے ہوئے بولیں۔

''خانم مجھے معاف بھی کر دو اور آج ایک وعدہ بھی کرو کہ میرے بعد میرے بچوں کا خیال رکھو گی۔''

''میری پیاری آپا یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔ بھلا یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آپ کے بچوں کا اور آپ کا بھی خیال رکھوں گی۔ لیکن اب آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ روئیں گی نہیں اور سو جائیں گی۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ ان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہو گئی اور انہوں نے ایک دم بہت بڑی خون کی قے کی اور خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔ میں نے اپنے دوپٹے سے ان کا منہ صاف کیا اور آپا کی طرف بھاگی کہ بستر کی چادر لاؤں۔ اتنے میں آپا وہاں پانی لے کر جو پہنچیں تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور فوراً سرور بھائی کو اٹھا لائیں۔ انہوں نے شنو آپا کو سرسری سا دیکھا اور ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ ڈاکٹر بھی ایچی سن کالج میں ہی رہتا تھا۔ سائیکل پر جانے آنے میں آدھا گھنٹہ تو لگ ہی گیا ہو گا۔ ڈاکٹر نے آ کر نبض دیکھی تو گردن ہلا کر بولے کہ آپا کو فوت ہوئے گھنٹہ یا پون گھنٹہ

ہو چکا ہے۔

''ہائے! میری شنو آپا۔ آپ کو میں نے ہمیشہ کے لیے سونے کو تو نہیں کہا تھا۔'' اور مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میری جان سے پیاری آپا ڈھیروں مٹی تلے چھپ چکی تھیں۔

چوتھا باب

چمن سے پہنچنے میں اصغر بھائی کو دو تین دن تو لگ ہی جانے تھے اس لیے ان کا انتظار کئے بغیر ہی شنو آپا کو دفنا دیا گیا۔ تار کے ذریعے ان کو اطلاع دے دی مگر ہفتے بعد ان کا خط ملا کہ وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے جلدی نہیں آ سکیں گے اور ساتھ ہی بچوں کے اخراجات کے لیے دو سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا۔ مینہ اور فیروز کچھ دن پریشان رہے لیکن شاید انہوں نے خود ہی سوچ کر دل کو سمجھا لیا۔ میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی تھی انہیں بتاؤں کہ ان کی زندگی میں کیا انقلاب آیا تھا۔ کیونکہ تینوں بچے مجھ سے بہت پیار کرنے لگ گئے تھے۔ میں نے سوچا شاید انہیں بہت زیادہ احساس ہی نہ ہوا ہو۔

نہ جانے بڑی آپا کو کیا سوجھی کہ خوشنودہ کو پڑھائی سے اٹھا کر اس کے چچازاد سے اس کی بات پکی کر دی اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سوائے میرے سب لوگوں کا دھیان بٹ گیا لیکن میں دل ہی دل میں غم کرنے لگی کہ اصغر بھائی شادی میں آئیں گے تو بچوں کو لے جائیں گے۔ میں نے بچوں سے ذکر کیا تو میرے بغیر جانے سے صاف منکر ہو گئے۔ فیروز اور مینہ تو بضد ہو گئے کہ پہلے ان کی امی کو بلایا جائے پھر وہ جائیں گے۔ بڑی آپا کی مصروفیت کی وجہ سے اب منزہ رات کو میرے پاس ہی سونے لگی۔ شکر

ہے اصغر بھائی شادی پر نہ آ سکے مگر میرے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا خوشنودہ کی بارات کے ساتھ اس کے تایا کے ملنے والے ملتان سے آئے تھے۔ ان کی خواتین نے مجھے دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں کون ہوں، کیا کرتی ہوں وغیرہ وغیرہ۔ جاتے وقت گلے کا ہار ہی بن گئیں کہ ملتان ان کے گھر آپا اور میں ضرور جائیں۔ آپا نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

''اگر قدم لکھے ہوں گے تو ان شاءاللہ ضرور آئیں گے۔''

وہ بہت ہی میٹھے لہجے میں بولیں۔ ''جی آپ کے قدم ہماری سر آنکھوں پر۔ آپ حامی تو بھریں۔ آپ کے لیے ہم گاڑی بھیج دیں گے۔''

بارات چلی گئی تو میں نے شکر کیا۔ پندرہ دن بعد جب خوشنودہ ملتان سے گھر آئی تو مجھے زوردار چٹکی کاٹ کر کہنے لگی۔

''خانم تمہاری دعا اللہ نے سن لی۔ تمہیں شہزادہ مل گیا۔''

''پاگل ہو گئی ہو خوشنودہ۔'' میں نے اسے ایک زوردار طمانچہ مارا۔

اس نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی اور بولی۔ ''میں تو پاگل نہیں ہوئی مگر تم اسے دیکھو گی تو ضرور پاگل ہو جاؤ گی۔''

اپنی حیرانی اور جذبات کو چھپاتے ہوئے میں نے بڑے سکون

سے سوال کیا۔

''کون ہے یہ؟''

''میری شادی پر چچا کے ملنے والے جو آئے تھے ان کی بیٹی نے تو یہاں سے جاتے ہی میرا دماغ کھا لیا کہ اپنی پیاری سی خالہ کا رشتہ اس کے بھائی سے کراؤں۔ اس نے یہ تصویر بھی دی ہے۔ اب تم اسے تکیے کے نیچے نہ رکھ لینا۔ اس کی امانت ہے جو میں نے واپس کرنی ہے۔''

پھر آنکھیں مٹکا کر بڑی لجائی ہوئی سی بولی۔

''اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ موصوف ایچی سن کالج کے ہی پڑھے ہوئے ہیں۔''

مجھے یوں لگا کہ میرے سینے سے صرف میرا دل ہی نہیں میری دھڑکن آس پاس کی ہر چیز نکال باہر کرے گی۔ یہ اچانک قدرت کو کیا ہو گیا میری زندگی میں اتنا حسین موڑ کہاں سے آ گیا۔ خدایا خواب تو صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ پورا کیسے ہونے لگا..... ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ منزہ کے رونے کی آواز نے میری سوچ کا تسلسل توڑ دیا..... اور میں منزہ کی طرف دوڑی۔ اسے تھپک کر سلایا اور خود بستر پر لیٹی لیٹی رات گئے تک سوچتی رہی کہ اگر اتنے ہی اصرار سے وہ لوگ مجھے اپنانا چاہتے ہیں تو ماننے میں کیا حرج ہے۔ مگر ان معصوم بن ماں کے بچوں کا کیا بنے گا اور میرا وہ خواب کہ میں نے شادی کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا ادھورا رہ جائے گا۔ پھر

خیال آیا کہ شہزادے بھی تو کبھی کبھار ہی راستہ بھول کر اپنا گھوڑا دوڑاتے کسی حسینہ کی قسمت چمکانے اس کے در پر دستک دیتے ہیں۔ واقعی میں شاید ہوش کھو بیٹھی تھی۔ آدھی رات کو اٹھ کر چھوٹا شیشہ غسلخانے میں لے جا کر ہر زوایے سے بڑی دیر تک اپنی شکل دیکھتی رہی۔ پھر خود ہی شرما کر شرمندہ سی بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ شاید خوشنودہ کی آنکھ کھل گئی اور اس نے میری بے کلی محسوس کر لی اور وہ اپنا بستر چھوڑ کر منزہ اور میرے ساتھ آ کر لیٹ گئی۔ کافی دیر اپنے میاں اور سسرال کے قصے سناتی رہی۔ سونے سے پہلے اپنے چچا کے ملنے والوں کی بڑی تعریفیں کر کے مجھے سمجھاتی رہی کہ ان کا رشتہ قبول کر لوں تا کہ وہ بڑی آپا سے بات کرے اور پھر ملتان سے وہ لوگ باقاعدہ رشتہ لینے آئیں۔ مگر میں نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور وہ دل برداشتہ ہو کر ملتان چلی گئی۔

شنو آپا کے چالیسویں کے بعد سے ہی اصغر بھائی ہر پندرہ سولہ دن بعد بڑی آپا کو ایک خط لکھنے لگ گئے تھے۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ بچوں کو لے جانے کا اصرار کرتے ہوں گے کیونکہ بڑی آپا ہر دفعہ خط پڑھ کر تھوڑی دیر پریشان سی لگتیں اور پھر سر جھٹک کر اپنے کاموں میں لگ جاتیں۔ ایک دن جب تینوں بچے سو چکے تو آپا میرے پاس آئیں اور بڑے پیار سے بولیں۔

''دیکھو خانم میں تمہاری ماں کی طرح ہوں اور تمہارا برا کبھی بھی

نہیں چاہوں گی۔''

''جی بڑی آپا میں نے بھی آپ کو یہی سمجھا ہے۔''

''تو بہن ان بچوں کو تم اپنے سے ذرا دور رکھنا شروع کرو تا کہ یہ تمہارے بغیر بھی رہ سکیں۔ آخر ان کا باپ آ کر انہیں لے جائے گا۔''

''آپا جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''خانم وہ وقت آ گیا ہے۔ اگلے ہفتے اصغر ان کو لینے آ رہا ہے۔''

''اچھا آپا کوشش کروں گی۔'' آپا کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا مگر اکثر سوچتی کہ اصغر بھائی انہیں لے جا کر خود تو اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے یہ بچے نہ جانے کس طرح پلیں گے۔ انہیں پڑھانا، نہلانا، کھلانا، سلانا ایک دھندا تو نہیں ہوتا بچوں کا وہ کون کرے گا..... پھر سوچتی اچھی سی آیا رکھ لیں گے۔ لیکن اگلا خیال آئے، اگر وہ اچھی نہ ہوئی تو؟ منزہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے شاید بڑے دونوں کو لے جائیں اور منزہ کو میرے پاس چھوڑ جائیں گے۔ یا پھر دوسری شادی کر لیں گے۔ یہ سوچ کر تو کلیجہ ہی منہ کو آ گیا۔ بھلا ایسی کون سی سوتیلی ماں ہوگی جو تین عدد سوتیلے بچوں کو ماں کا پیار دے گی۔ اس سے تو یہ بچے میرے پاس ہی بھلے ہیں۔ کیونکہ اگر ان بچوں کا حال برا ہوا تو قیامت میں شنو آپا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اور کیا بچوں کو دکھی دیکھ کر ان کی روح نہیں تڑپے گی۔ مجھے دن رات یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

حسب پروگرام اصغر بھائی آ گئے اور پتا چلا کہ اپنی تبدیلی لاہور

کروانا چاہتے ہیں۔ روزانہ شام کو دفتر سے آ کر بچوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اگر وہ کوئی کھیل کھیلتے تو بچے کہتے۔ ''خانم خالہ کھیلیں گی تو ہم کھیلیں گے۔'' کہیں باہر جانا ہوتا تو بچے ضد کرتے کہ ''خانم خالہ جائیں گی تو جائیں گے۔'' ایک دو دن تو کافی گڑبڑ رہی لیکن پھر میرے سمجھانے سے بڑے دو تو مان گئے مگر منزہ میرے ساتھ ہی چپکی رہتی۔ اب جو اصغر بھائی کے جانے کا دن آیا اور انہوں نے بچوں کا سامان تیار کرنے کو کہا تو فیروز اور مینہ بضد ہو گئے کہ پہلے ان کی امی کو بلایا جائے ورنہ وہ نہیں جائیں گے۔ میں نے انہیں ایک طرف لے جا کر سمجھایا کہ ان کی امی اب اللہ کے پاس سے نہیں آ سکتیں تو کہنے لگے۔ ''پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' اور اصغر بھائی نے ذرا ڈانٹ کر کہا تو دونوں رونا شروع ہو گئے اور ان کی دیکھا دیکھی منزہ نے بھی رونا شروع کر دیا۔ اور گھر میں شنو آپا کا غم پھر سے ہرا ہو گیا۔ آخر اصغر بھائی نے ہتھیار ڈال دیے اور بچے میرے پاس ہی چھوڑ گئے۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور بچے بھی خوش ہو گئے۔

لاہور سے جانے کے آٹھ دن بعد ہی اصغر بھائی کا خط آیا اور چار دن بعد ہی دوسرا اور شاید دسویں دن تیسرا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپا پریشان سی ہو کر میری طرف دیکھتی ہیں اور کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہیں۔ لیکن میری ہمت نہ پڑتی کہ وجہ پوچھوں۔ ادھر خوشنودہ کے دو خط میرے نام آ چکے تھے کہ میں کوئی فیصلہ کروں۔ کاش بڑوں کی طرح ایک دم فیصلہ کرنے کی

صلاحیت مجھ میں ہوتی۔ ایک طرف بقول خوشنودہ کے میرے خوابوں کا شہزادہ ہاتھ پھیلائے کھڑا میرا منتظر تھا اور دوسری طرف اپنی بہن سے کیا ہوا وعدہ..... اور مجھے خود اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہی ایک دن سرور بھائی اور بڑی آپا نے یہ فیصلہ سنایا کہ بیس دن بعد اصغر بھائی سے میری شادی ہو رہی ہے..... ناگاساکی اور ہیروشیما پر تو پچھلے سال بم گرا تھا۔ میرے اوپر اس دن پڑا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ بقول سب کے دو گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تو آپا اور سرور بھائی الگ پریشان تھے اور پاس بیٹھے بچے مجھے پنکھا بھی جھل رہے تھے اور روتے روتے لگاتار کہتے جا رہے تھے۔

''خانم خالہ آپ نہ اللہ میاں کے پاس چلی جانا۔''

میں نے تینوں کو سینے سے لگا لیا۔ اپنے متعلق کچھ بھی فیصلہ کرنے کے لیے میری زبان پر تو جیسے تالے پڑ گئے۔''

میں نے یہاں تک ہی ڈائری پڑھی تھی کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور چچی اندر آتے ہی گھبرا کر بولیں۔

''ارے مومنہ! کیا ہوا تم رو کیوں رہی ہو۔ بھئی امی ابو یاد آتے ہیں تو فون کر لیا کرو۔ چلو اٹھو تمہیں سیر کرا لاؤں۔''

میں نے غسلخانے جا کر اپنا منہ دھو کر شیشے میں دیکھا تو واقعی پتا چلا کہ ڈائری پڑھتے پڑھتے کافی روئی ہوں گی جب کمرے میں آئی تو چچی پیچھے پڑ گئیں کہ انہیں رونے کی وجہ بتاؤں۔ شکر معقول وجہ میرے ذہن میں آئی

اور میں نے کہہ دیا کہ کوئی دردناک ناول پڑھ رہی تھی۔ نیچے کچن میں جا کر دونوں نے ہاٹ ڈاگ کا برگر بنایا اور کھاتے کھاتے نکل پڑے۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے پوچھا۔

''چچی جان آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''بھئی میری ایک کولیگ کی بیٹی نے ہائی اسکول سے گریجوایٹ کیا ہے اس کی پارٹی ہے۔''

''بھلا میں کیا کروں گی جا کر۔''

''بڑی بور لڑکی ہو ذرا نئی دنیا تو دیکھو۔''

میں خاموش ہوگئی اور تھوڑی دیر بعد ہم ان کی دوست کے گھر پہنچ گئے۔ وہ ہمیں گھر کے باہر ہی مل گئی میری طرف قدرے حیرت سے دیکھ کر بولی۔

She must be your friend from Pakistan

(یہ تمہاری پاکستانی مہمان ہوگی) چچی نے میرا تعارف کرایا اور ہم گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ چار پانچ مرد اور شاید آٹھ خواتین نیم عریاں لباس پہنے کافی بے تکلفی سے گپ شپ لگا رہے تھے۔ چچی بھی ان میں گھل مل گئیں اور میں؟ میں گھبراہٹ، حیرت اور ناپسندیدگی کے ملے جلے جذبات کو قابو رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد چچی کی دوست آئی اور بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی کہ وہ مجھے اپنی بیٹی سے ملوانا چاہتی ہے اور مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور یوں ہمارا تعارف ہوا۔

''جینی یہ مومنہ ہے۔ اور مومنہ یہ میری بیٹی جینی ہے اور یہ چالز اس کا بوائے فرینڈ ہے۔ یہ شیری ہے میری بھتیجی اور یہ ڈگلس اس کا بوائے فرینڈ۔'' ہم سب نے امریکن سٹائل میں ہائے ہائے کیا اور مجھے اپنا آپ یوں لگنے لگا جیسے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ بھلا اس ماحول سے میرا کیا تعلق۔ جی چاہا کوئی غیبی راستہ ملے اور میں بھاگ جاؤں مگر ایسی باتیں تو کہانیوں میں ہی ہوا کرتی ہیں۔ وہ چاروں مجھ سے تو سرسری بات ہی کرتے رہے لیکن آپس میں ان کی ساری گفتگو ان کے مستقبل کے متعلق تھی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اب وہ ماں باپ کی پابندی سے آزاد تھے اور اپنے والدین کے گھروں سے بوریہ بستر گول کر کے جہاں چاہیں رہ سکتے تھے۔ یہ آزادی انہیں قانون کی طرف سے حاصل تھی اور ماں باپ اس معاملے میں بے بس تھے۔ لڑکے لڑکیاں جس طرح چاہیں اپنی دوستی اور محبت کی پینگیں چڑھا سکتے تھے۔ البتہ اکیس سال کی عمر سے پہلے شادی ماں باپ کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حرکتیں اور باتیں سن کر مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ مجھے بخار چڑھنا شروع ہوگیا۔ سوچا بڑوں کی محفل میں ہی چلی جاؤں تو وہاں بھی اس سے ملتا جلتا ماحول تھا۔ چچی پر غصہ آ رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ انہوں نے کیوں گھسیٹا۔ میں خیالوں میں گم تھی کہ ان چاروں کی آواز آئی۔

Lets have a cool dip (چلو ٹھنڈا غوطہ لگائیں) لڑکوں نے پہلے ہی صرف نیکر پہنے ہوئے تھے۔ لڑکیاں بھی آن کی

آن میں دو حصوں میں بنے ہوئے تیراکی کے کپڑے پہن آئیں۔ وہ بھی برائے نام ہی تھے۔ شکر ہے انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا اور چاروں کے چاروں سوئمنگ پول میں چھلانگیں لگاتے ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہو گئے پھر کیا تھا ہنسی مذاق، چیخیں اور پانی میں ہلچل نے میرے رہے سہے ہوش بھی گم کر دیئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسکنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا۔ دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ چچی مل گئیں۔ وہ مجھے کھانے پینے کے لیے بلانے آ رہی تھیں۔ پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ کچن میں ہی سب چیزیں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ سب لوگ بے تکلفی سے خود ہی لے لے کر کھا رہے تھے۔ ہماری پارٹیوں کی طرح اسراف نہیں تھا۔ سادہ چاکلیٹ کیک، سلاد کا بڑا سا پیالہ، روسٹ کی ہوئی ٹرکی کے کاٹے ہوئے ٹکڑے، چپس اور کچھ چٹنیاں اور تازہ پھل پینے کے لیے کافی تھی اور ایک بیرل نما کولر میں کوئی مشروب تھا جو چچی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ شراب تھی۔

ایک طرف کونے میں جینی کو دیئے گئے تحفے پڑے تھے جن میں زیادہ تر گھریلو قسم کی چیزیں تھیں۔ چھوٹے بڑے سوٹ کیس، تھوڑی سی کراکری اور پکانے کے ایک دو پتیلے۔ غرض روزمرہ استعمال کی چیزیں تھیں۔ جس طرح ہمارے ہاں شادی پر لڑکی کو دیا جاتا ہے۔

گویا جینی بن بیاہے ہی گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا پیارا ملک یاد آنے لگا۔ کہ لڑکی جب ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہے تو

والدین، بہن بھائی یہاں تک کہ دور کے رشتہ داروں کے مضبوط حصار سے نکل کر دلہا کی محبت اور حفاظت میں پورے سسرال کی چاہتوں اور ارمانوں کے محفوظ قلعے میں داخل ہوتی ہے۔ جینی بے چاری اکیلی ماں باپ سے دور سچی محبت کی تلاش میں شاید ساری عمر سرگرداں رہے گی اور شاید پھر بھی نہ حاصل کر سکے گی۔ میں نے سوچا میں جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کروں کم ہے کہ میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور ہمارے مذہب میں پیدا ہونے کے دن سے لے کر مرتے دم تک رشتوں کی لطافت اور محبت کے مختلف روپ انسان کو زندگی کا مقابلہ کرنے اور جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ شکر ہے پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چچی جان کو کوئی کام یاد آ گیا اور انہوں نے میزبان سے رخصت چاہی۔ وہ کار تک چھوڑنے آئی اور چچی سے درخواست کی کہ اگلے دن اس کی والدہ کو سالگرہ کے پھول پہنچا دیں۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ چھٹیاں منانے واشنگٹن جا رہی تھی۔ چچی نے پوچھا جینی بھی جائے گی تو بولی۔

''نہیں وہ گھر پر ہی ہوگی۔ ویسے فکر کی کوئی بات نہیں اس کا بوائے فرینڈ اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ جینی کا خیال رکھے گا۔''

آخری جملے نے تو میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں نے تو کسی بھی مذہب یا دین کو بالائے طاق رکھ دیا ہے یہ ایک ماں اپنی بیٹی کے لیے کہہ رہی تھی..... شکر ہے چچی جان کار کا دروازہ کھولے

مجھے بیٹھنے کو کہہ رہی تھیں۔ ورنہ شاید میں چکر کھا کر گر ہی جاتی حیرت اس بات کی تھی کہ چچی ان لوگوں سے کیسے میل جول رکھتی ہیں۔ دادی ہمیشہ کہتی تھیں کہ اگر طبیعت بوجھل ہو تو نفل پڑھنے چاہیں۔ گھر پہنچ کر میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پہلے تو خوب گرم پانی سے شاور لیا اور پھر دو نفل پڑھ کر بہت دیر سجدے میں گری رہی۔ اللہ جانے اس بے ہنگم پارٹی سے میرا موڈ کیوں اتنا خراب ہو گیا تھا۔ خیر یہی سوچا کہ امریکا کے بیہودہ ماحول کو بھولنے کا ایک ہی طریقہ میرے پاس ہے کہ دادی کی ڈائری پڑھی جائے۔ آدھی رات تک پڑھتی رہی دکھی بھی بہت ہوئی مگر پڑھے بغیر چین بھی نہیں آ رہا تھا۔ اور نہ جانے کب ڈائری سینے پر ہی رکھے سوگئی۔ دادی نے لکھا تھا —:

❀❀❀

پانچواں باب

جیسے ہی خوشنودہ کو بڑی آپا اور سرور بھائی کے فیصلے کا پتا چلا کہ انہوں نے میری شادی اصغر سے طے کر دی ہے تو فوراً لاہور آ گئی اور میری طرفداری میں ماں باپ سے کافی جھگڑا کیا مگر ان دونوں کی ایک ہی دلیل تھی کہ اگر ایسا نہ ہوا تو اصغر بھائی کہیں اور دوسری شادی پر تلے ہوئے تھے۔ جب وہ نہ مانے تو خوشنودہ نے اپنا لائحہ عمل بدلا اور مجھے اکسانے لگی کہ میں انکار کر دوں۔ اٹھتے بیٹھتے کہتی۔

''خانم پاگل نہ بنو۔ شادی کے لیے جذبہ بھی ضروری ہے مگر تھوڑی عقل بھی استعمال کرنی چاہیے اور اس شادی کے پیچھے نہ تو صحیح جذبات ہیں اور نہ ہی عقلمندی۔'' کبھی کہتی۔

''خانم ہوش سے فیصلہ کرو۔ آنکھیں کھول کر کنویں میں چھلانگ نہ لگاؤ۔'' لیکن مجھے تو شاید سکتہ لاحق ہو گیا تھا یا پھر انہونی نے ہونا تھا اور عقل اور زبان میرا ساتھ چھوڑ چکی تھیں ہر طرف اندھیرا اور خلا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔ نماز کے بعد رو رو کر اللہ سے پوچھتی کہ ''مجھے اتنی بڑی آزمائش میں کیوں ڈالا جا رہا ہے۔'' لیکن شاید اللہ تعالیٰ بھی کبھی کبھی فیصلہ سنا کر کہیں اور مصروف ہو جاتے ہیں اور مدعی کی فریاد عرش سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی ہے۔ کبھی سوچتی جب خوشنودہ نے شادی کے لیے کہا تھا تب ہی مان جاتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

لیکن اس فیصلے سے شاید میرا بھلا ہو جاتا مگر ان بچوں کا کیا بنتا..... پھر سوچتی جب ان بچوں کی ماں نے زندہ ہی نہیں رہنا تھا تو انہیں پیدا ہی کیوں کیا..... مگر میری سوچوں سے کیا فرق پڑنا تھا۔ وقت بڑا ظالم ہے کسی کا انتظار نہیں کرتا..... بھلا بیس دن گزرنے میں کون سی دیر لگتی تھی..... اور پلک جھپکتے میں میری شادی کا دن آ گیا۔

شادی کے دن مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر بچے بہت حیران تھے۔ لیکن شاید فیروز اور مینہ کو کسی نے بتا دیا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔ منزہ بے فکر تھی۔ بڑی آپا کے آنسوؤں کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا اور خوشنودہ تو غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ اور میں؟ میرا کیا تھا مرے باندھے قبل از مرگ سجی سجائی لاش کی طرح ایک اجنبی کے ساتھ ایک انوکھے سے سفر پر روانہ ہو گئی جو شادی میں شامل تھے وہ بھی حیران تھے اور جنہوں نے بعد میں سنا وہ بھی ششدر رہ گئے۔ سرور بھائی کے دوست کی گاڑی کا بندوبست تھا اور انہیں کے گھر ہم دونوں نے رات گزارنی تھی۔ دولہا میاں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے جسم کی کپکپاہٹ محسوس کر لی اور بولے۔

''خانم فکر نہ کرو میں تمہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ ڈرو نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بات تو انہوں نے سرگوشی میں کی تھی لیکن مجھے لگا میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اگلے دن ہم آپا کے گھر آ گئے اور میرے سوا باقی

سب ٹھیک تھا۔ سب کی زندگی حسب معمول تھی صرف میرا سوچا ہوا مستقبل رشتوں کی کتاب میں بند کر دیا گیا تھا۔

اصغر بھائی اب میرے لیے اصغر رہ گئے اور میں بچوں کی خانم خالہ کی بجائے امی ہو گئی۔ واہ! رے میری قسمت بنانے والے۔

جب بچوں کو پتا چلا کہ ان کے ساتھ اب میں بھی ان کے گھر جاؤں گی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور فوراً جانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ لیکن اصغر نے بہتر سمجھا کہ جب تک ان کی تبدیلی لاہور نہ ہو جائے ہم لوگ بڑی آپا کے پاس ہی رہیں۔

چودہ اگست کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کیا گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا اور کچھ ہی دنوں بعد پتا چلا کہ ہمارے قریبی عزیز بخریت کراچی پہنچ گئے تھے۔ بڑے دنوں بعد حسن ماموں کی آواز آئی۔ ''سرور، ارے بھئی سرور کہاں ہو۔ دیکھ لو آخر اللہ نے کامیابی دے ہی دی۔'' حسن ماموں، اماں کے دور کے رشتے کے بھائی تھے مگر سرور بھائی سے بہت بنتی تھی۔ ماموں کی آواز سنتے ہی سرور بھائی ہاتھ میں تولیہ لیے غسلخانے سے برآمد ہوئے اور بڑے تجسس سے پوچھا۔

''بھئی کون کامیاب ہو گیا۔''

''میں تمہیں ہمیشہ کہتا تھا کہ محمد علی جناح نے جو دو قومی نظریہ پیش کیا ہے ایک دن رنگ لائے گا اور مسلمان، انگریز اور ہندو کے تسلط سے آزاد ہو

جائیں گے۔"

"چلیے ماموں میں نے مان لیا کہ آپ جن لیڈروں کے مداح ہیں وہ بڑے اونچے لوگ ہیں۔"

"ارے میاں! صرف لیڈر تھوڑا ہی سب کچھ کر سکتے ہیں اس تحریک کو کامیاب کرنے کی سعادت تو علمائے دین اور غریب مسلمانوں کے حصے میں بتہ زیادہ آتی ہے جنہوں نے دامے درمے سخنے سے بڑھ کر آزادی کے لیے اپنی جان تک نذر کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اور اگر تم نے تاریخ پڑھی ہے تو یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء سے جاری ہے۔"

"ماموں تاریخ کے چکر کو چھوڑیں۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان چلائے گا کون؟ پڑھے لکھے لوگ تو زیادہ ہندوستان میں رہ گئے۔ ویسے ختم کریں اس بحث کو میں حلوہ پوری لاتا ہوں آپ بہت عرصے بعد آئے ہیں۔"

حسن ماموں کچھ اداس ہو گئے اور قدرے توقف کے بعد بولے۔

"سرور بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ دیکھو نا ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع گرداسپور، فیروز پور، جالندھر اور امرتسر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن انگریزوں نے سازش کر کے آخری وقت انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا۔"

میں نے پوچھا۔ "ماموں جان بھلا اس میں انگریز کا کیا فائدہ تھا۔"

"ارے! بیٹی یہ بڑی لمبی بات ہے۔ مختصر یہ کہ گرداسپور کا ضلع ستلج پر ہیڈ ورکس کے کنٹرول کی خاطر تا کہ پاکستان کو پانی اور کشمیر سے دور رکھا جائے۔"

سرور بھائی نے لاتعلقی سے کہا۔

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے ماموں جان۔"

"خدا کے بندے! میں شاید ٹھیک نہیں کہہ رہا بلکہ سو فی صد ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اور تم جو کہہ رہے ہو کہ پاکستان چلے گا کیسے تو بھئی محمد علی جناح کے ذہن میں پورا پلان ہے۔"

"چھوڑیں بھی ماموں قانون تو سارا ہمارا انگریز کا بنایا ہوا ہے۔"

"ارے پگلے چودہ جولائی کو دہلی میں جناح نے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے پریس کانفرنس کی تھی اور اس میں سوال کیا گیا کہ کیا پاکستان سیکولر ریاست ہوگی یا تھیوکریٹک ریاست ہوگی۔"

سرور بھائی نے ماموں کی بات کاٹی اور بولے۔

"ماموں یہ بڑے گہرے فیصلے ہوتے ہیں۔ چھوڑیں ہمیں سیاست کا کیا پتا۔ میں حلوہ پوری لاتا ہوں شغل رہے گا۔"

"سرور میاں تمہیں جناح کا جواب تو سننا ہی پڑے گا۔" ہاں! تو انہوں نے کہا۔

"جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہم نے جمہوریت چودہ سو

سال پہلے سیکھی تھی۔'' اور بڑے فخر سے ماموں پھر بولے۔

''تو سرور صاحب ان شاء اللہ پاکستان کو اسلام کے اصولوں پر چلائیں گے اور یہ ملک ایک مثالی ملک ہوگا۔''

''ماموں کیا مثالی ملک ہوگا۔ بنگال اور پنجاب کا بٹوارہ تو سازشوں کی نظر ہوا۔ باقی راجواڑے بھی جو پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ مثلاً جوناگڑھ، حیدرآباد دکن اور کشمیر وغیرہ انہیں بھی انگریز کے ساتھ مل کر ہندو بزورِ طاقت ہندوستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کر دے گا اور انگریز توبہ بجا کر کہتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی تقسیم ایسی کی ہے کہ چھ ماہ سے زیادہ پاکستان قائم ہی نہیں رہ سکتا۔''

ماموں جان ہمت نہ ہارے اور پراعتماد لہجے میں بولے۔

''یہ ملک معجزاتی طور پر وجود میں آیا ہے اور ان شاء اللہ معجزاتی طور پر قائم اور خوشحال بھی رہے گا اور معجزہ صرف اللہ کی مشیت سے ہی ظہور میں آتا ہے۔''

''خدا آپ کے اعتماد کو قائم رکھے۔ کہیں تو اب حلوہ پوری لے آؤں۔''

''ارے بھئی لے آؤ..... ذرا تیز سائیکل چلانا بیڈن روڈ کافی دور ہے۔'' سرور بھائی چلے گئے اور ماموں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''گڑھی شاہو جاتے وقت نہر کے کنارے جو انگریزوں کی

خوبصورت کوٹھیاں ہیں وہ اب مسلمان افسروں کو ملا کریں گی۔ شاید اصغر کو بھی مل جائے۔ ہندو سکھ تو کافی جا چکے ہیں عنقریب انگریز بھی بوریا بستر گول کریں گے۔''

مسلمانوں کو خوشحالی تو ملنے والی تھی مگر روزانہ موچی دروازے اور رنگ محل سے آگ کے خوفناک بادل اٹھتے دکھائی دیتے تھے اور بچوں کو اسکول سے جلدی بلوانا پڑتا تھا۔ اسکولوں میں نفری بالکل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ بچوں کی بھی اور اساتذہ کی بھی۔ مجھے نہ جانے کیوں خوف و ہراس اور غیر یقینی کی کیفیت ساری فضا میں حلول کی ہوئی لگتی تھی۔

ہندوستان سے خبریں آنے لگ گئیں کہ ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور مسلمان کسمپرسی کی حالت میں پاکستان کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

میں شاید زندگی کے نئے موڑ پر اپنے مقام کی تلاش میں حیران و پریشان تھی اور اپنے اردگرد سے بے نیاز تھی۔ لیکن گھر میں سرور بھائی اور بڑی آپا بہت غمزدہ اور پریشان سے رہنے لگے تھے۔ ایک دن میں منزہ کو کپڑے بدلا رہی تھی کہ حسن ماموں آ گئے۔ ان کے آنے سے ذرا گپ شپ اچھی رہتی تھی میں نے کہا۔

''آیئے ماموں جان! آپا اور بھائی کسی کام سے باہر گئے ہیں ابھی آتے ہی ہوں گے۔''

میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ کچھ اداس سے لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے بھی کافی وحشت سی ٹپک رہی تھی آخر میں وجہ پوچھ ہی ڈالی وہ بولے۔

''بیٹی تمہیں ساری کتھا کیا سناؤں قصہ مختصر یہ کہ ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں سے انگریز دشمنی کا بھرپور مظاہرہ کر دکھایا ہے۔''

''وہ کیسے ماموں جان؟ جتنا بھی بنا پاکستان تو بن گیا۔''

''ایک تو اس نے پاکستان کے حصے کی رقم اور اثاثے رکوا دیئے اور پاکستان کے حصے میں آنے والی فوج کو ادھر ادھر بکھیر دیا اور عین وقت پر حد بندی اپنی مرضی سے کروائی تاکہ پاکستان اچھی طرح دفاع نہ کر سکے۔''

''ماموں جان یہ تو بہت برا ہوا، دفاع تو بہت ضروری ہے۔''

ماموں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور میں بھی پریشان سی ہوگئی اور ایک اور سوال کر ڈالا۔

''ماموں جان آخر قائداعظم نے کیوں نہ کچھ کیا؟''

''بیٹی قائداعظم کب خاموش رہنے والے تھے۔ ۱۰ اگست کو انہوں نے چودھری محمد علی کو وائس رائے سے ملاقات کے لیے بھیجا اور پیغام بھجوایا کہ اگر گرداسپور ہندوستان کو دیا گیا تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔''

''تو ماموں جان اب مسئلہ کیا ہے۔''

''میری نادان بھانجی ماؤنٹ بیٹن جانتا تھا کہ اس بٹوارے کی وجہ

سے سکھ غارت گری کریں گے بلکہ انہوں نے الٹی میٹم بھی دے رکھا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے کسی بھی سکھ لیڈر کو حراست میں نہیں لیا۔''

''یہ تو بہت ناانصافی ہے۔''

ماموں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونا شروع کر دیا اور بولے۔

''بیٹی بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔''

''ارے ماموں آپ نے رونا کیوں شروع کر دیا۔ قائداعظم کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔''

مگر ماموں جان کی ہچکی بندھ گئی اور میں نے جھٹ صراحی میں سے انہیں پینے کے لیے پانی دیا۔ اتنے میں سرور بھائی اور آپا آ گئے۔ ماموں انہیں دیکھ کر زیادہ ہی بھڑک اٹھے اور دھاڑیں مارتے ہوئے سرور بھائی کے گلے لگ گئے۔ اور بولے:

''سرور ظلم کی انتہا ہوگئی۔ امرتسر سے میری بہن بہنوئی اور بچوں نے آج آنا تھا جب میں ریلوے اسٹیشن گیا تو وہاں داخلہ بند تھا اور پتا چلا کہ ساری ٹرین میں زندہ کوئی بھی نہیں سب لاشیں ہی لاشیں ہیں اور یہ پتا چلا کہ گورنمنٹ کی طرف سے سب کو دفنایا جا رہا ہے۔ سب نے ماموں کو بہت تسلیاں دیں مگر ظاہر ہے ان کا دکھ وہ خود ہی محسوس کر سکتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد تو آئے دن ہی اخباروں میں قتل و غارت کی خبریں آنے لگیں اور لاکھوں کی تعداد میں بے سروسامان مسلمان ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ تو

پہنچ پائے اور بہت سوں کو قتل کر دیا گیا۔ جوان لڑکیاں اغوا ہو گئیں اور کئی لوگ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جہاں موت آئی وہیں بے گور و کفن پڑے رہ گئے۔

پاکستان سٹڈی تو ہم نے اسکول اور کالج میں بہت پڑھی مگر دادی کی ڈائری میں پاکستان بننے کے بعد کے حالات پڑھ کر اتنا دکھ ہوا کہ آگے پڑھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ میں نے لیمپ بجھایا اور بہت دیر تک سوچتی رہی کہ پاکستان اتنی قربانیوں اور جدوجہد سے حاصل کیا گیا تھا اور آزادی میں حصہ لینے والوں کے عمل اور ارادے کتنے عظیم اور پختہ تھے لیکن میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے سیاسی طور پر ملک میں بدامنی ہی دیکھی۔ کراچی میں تو دن دیہاڑے لوٹ مارے اور قتل وغیرہ کی وارداتیں سننے میں آتی ہیں۔ آرمی دخل دے کر امن امان بحال کر دیتی ہے مگر کچھ عرصہ بعد پھر گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے۔ غالباً پاکستان کا دشمن ابھی تک اپنے ایجنٹوں کی مدد سے دیمک کی طرح پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں مصروف ہے۔ مجھے ڈائری میں حسن ماموں کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ جاتے ہیں کہ ''پاکستان معجزاتی طور پر وجود میں آیا تھا اور اسی طور اللہ اسے قائم و دائم رکھے گا۔'' میرا پاکستان، مجھے اپنے ملک اور گھر کی یاد ہمیشہ سے زیادہ آنے لگی اور جانے کب میں سو گئی۔

اگلے دن صبح صبح چچی نے اٹھا دیا کہ شیرن کی والدہ کو سالگرہ کے پھول دینے جانا ہے۔ کار میں بیٹھتے ہی میں نے چچی سے پوچھا کہ ''چچی شیرن کی والدہ

کا گھر کتنی دور ہے۔''

بولیں: ''ایک گھنٹے کی ڈرائیو ہے ایک چھوٹا سا گاؤں مونٹی سیلو ہے۔ وہاں جا رہے ہیں۔''

راستے میں سٹور سے کارڈ اور پھول لئے اور فراٹے بھرتے صاف ستھری کھلی سڑکوں پر چل نکلے۔

میں تو یہاں کے قدرتی مناظر دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتی۔ دس پندرہ میل بعد ایک خوبصورت جھیل آ جاتی ہے اور میل ہا میل سفر کرتے رہیں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ کاش ایسا نہ ہوتا ویسا ہوتا۔ وقت کا احساس ہی نہ رہا اور ہم ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے رک گئے۔ چچی نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ میں تو سمجھی تھی کہ شانزے کی دادی جان کی طرح یہ بزرگ خاتون بھی کسی بہت کشادہ گھر میں رہتی ہوں گی چاروں طرف مالٹوں کا باغ ہوگا اور ایک طرف سرسوں کے لہلہاتے کھیت ہوں گے۔ شانزے کی باجی کی شادی میں ہم لوگ گئے تھے تو خوب مزہ آیا تھا۔ لیکن یہ امریکن دادی اماں شاید اسی بڑی سی عمارت کے کسی اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں گی۔

اندر داخل ہوتے ہی بڑی راہداریوں اور ہالوں سے ہوتے ہوئے ہم گزر رہے تھے مگر مجھے یہ عام قسم کی رہائشی بلڈنگ نہیں لگ رہی تھی شاید کسی عجائب گھر کا بھی یہاں عمل دخل تھا۔ کیونکہ ایک دو کمروں کے کھلے دروازوں میں میں نے تجسس کی جھانک تانک کی یوں لگا جیسے انسانوں کی ممیاں بنا کر پلنگوں پ

لٹائی ہوئی تھیں۔ شاید کچھ لوگ اپنے بزرگوں کو اس طرح محفوظ ہی کروا لیتے ہوں گے۔ امریکہ کی ترقی سے تو کچھ بھی بعید نہیں چچی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرہ خالی تھا۔ بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیاں سامنے دریائے میسپسی کا دلفریب نظارہ سارا دن بھی دیکھا جائے تو بور نہ ہونے دے۔ دریا کے کنارے چنار کے خوبصورت درخت اور کسی کسی جگہ درخت کے سائے میں پیارا سا بنچ پڑا ہوا۔ کہیں کہیں رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں اور پتھروں سے تراشی ہوئی بل کھاتی پگڈنڈیاں دریا کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ایک خوبصورت پلنگ پر بہترین بستر اور ساتھ میں ایک خوبصورت سی میز پر ایک عدد لیمپ اور گھڑی۔ ایک طاقچے میں ٹی وی اور اس کے اوپر خوبصورت پھولوں سے سجی ہوئی ایک ٹوکری۔ دیوار پر بے شمار گھر والوں کی تصاویر اور کارڈ۔ میں کمرے کی صفائی اور سجاوٹ سے ہی محظوظ ہو رہی تھی کہ چچی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ہائے!'' انہوں نے امریکن سٹائل میں سلام کیا میں نے جو مڑ کر دیکھا تو حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چچی ایک وہیل چیئر پر بیٹھی ممی سے مخاطب تھیں۔ Oh! No! میں نے سوچا یہ لوگ بھی پاگل ہیں بھلا مردے کو پھول بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرا خیال آیا کہ ہم سے شاید اچھے ہیں ہم تو قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں ان کا مردہ کم از کم نظر تو آ رہا ہے..... میں ابھی تقابل ہی کر رہی تھی کہ کرسی پر سے آواز آئی۔ ''ہائے! کیسی ہو۔''

ان دونوں کی ہائے سے تو میرا دل ہی ''ہائے'' ہو گیا۔ شکر ہے ڈر کے مارے میں کمرے سے بھاگ نہیں گئی۔ شکر ہے چچی نے انہیں پھول دے کر Happy Birthday کہا اور شیرن کا پیغام دیا تو میری جان میں جان آئی کہ وہ مردہ نہیں تھیں بلکہ زندہ سلامت تھیں شاید کافی کمزور اور بوڑھی تھیں تو میں سمجھی ممی ہوں گی۔ مگر میں نے سوچا کتنی بدنصیب ہیں ایک عدد بیٹا اور بیٹی یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر رہتے ہیں اور یہ بے چاری یہاں ان سے اتنی دور رہتی ہیں..... ایک یہ ان بچوں کی نانی اور دادی جن سے کل ملاقات ہوئی تھی اور ایک میری دادی تھیں۔ ابو ان سے کس قدر پیار کرتے تھے اور میرے لیے تو وہ ایک پوری کائنات تھیں۔ ذرا سا بھی ان کے سر میں درد ہو جاتا تو میں ان کے پاس ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ جہاں کہیں جانا ہوتا یا تو دادی ساتھ ہوتیں یا میں ان کے پاس رہتی تھی۔ امی بھی دادی کا بہت احترام کرتی تھیں۔ خیر چچی نے ان کا حال وغیرہ پوچھا اور تھوڑی دیر میں ہی بات چیت کے موضوع ختم ہونے لگے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور ان سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں رہ رہی تھیں۔ بڑی حسرت سے انہوں نے بتایا کہ جب تک وہ خود کو سنبھالنے کے قابل تھیں۔ اپنے گھر میں خوشحال زندگی گزار رہی تھیں۔ بیٹا اور بیٹی سال چھ مہینے میں آ ہی جاتے تھے گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر کلب چلی جاتی تھیں ایک کتا اور دو بلیاں پال رکھی تھیں انہیں بہت وقت دینا پڑتا تھا لیکن جب ستر سال کے لگ بھگ ہوئیں تو بہت سے کام کرنے مشکل لگنے لگے۔ پھر بچوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی مصروف زندگی کی

وجہ سے وہ انہیں اپنے گھر لے جا کر دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کا گھر اور سامان وغیرہ بیچ کر اس بوڑھوں کے ہاسٹل کا خرچہ برداشت کرنے کے پیسے بنائے اور تب سے وہ یہاں ہی رہتی ہیں۔ اپنے چہرے کا ملال اور آنسو چھپاتے ہوئے دیوار پر لگی ہوئی تصاویر کی طرف رخ کیا اور بتانے لگیں۔ ''یہ میری شادی کی تصویر ہے یہ میرے جب بچے چھوٹے تھے۔ اور اب یہ بچوں کی شادیوں کی تصاویر اور ان کے بچوں کی.....''

مجھے ان کی تصاویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہو رہی تھی میرے ذہن کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی کہ یہ سب وہ لوگ ہیں جو اس بزرگ خاتون کو زندہ درگور کر کے کچھ ہی فاصلے پر خود خوشحال اور مست زندگی گزر رہے ہیں..... ان کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور وہ بولیں کہ جب وہ جوان تھیں تو امریکا کچھ بھی نہیں تھا نہ گرم پانی نلکوں میں آتا تھا نہ کشادہ سڑکیں تھیں اور نہ ہی گاڑیاں۔ بہت مشقت کی زندگی تھی۔ مگر خاندان اکٹھے رہتے تھے وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ اس کے برعکس اب سہولتیں بے شمار ہیں مگر انسان اپنے خونی رشتوں سے بھی دور بھاگتا ہے۔ میں نے سوچا ساری دنیا میں تو انہوں نے Human Rights کے نام پر اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔ مگر اپنے ملک میں ماں باپ کے حقوق کا موضوع ہی ان کی روزمرہ زندگی کی کتاب میں نہیں۔ واپسی پر سارا راستہ میں خاموش رہی۔ گھر پہنچے تو چچا باہر ہی مل گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ ہم دونوں کہاں کی سیر کر کے آئے ہیں۔

میں نے کہا..... ''چچا جان زندہ بزرگوں کا قبرستان دیکھ کر آئے ہیں۔''

''ہیں بھئی! یہ جگہ تو میں نے بھی نہیں دیکھی۔'' وہ حیرت سے بولے۔

''فیروز یہ Senior Citizen Home کو کہہ رہی ہے۔''

چچی بھی میرے ریمارکس پر حیران تھیں۔ میں نے سوچا ایک طرف تو انہیں سینئر سٹیزن کا تمغہ دے رہے ہیں اور لے جا کر انہیں دنیا سے دور پھینکا ہوا ہے۔ یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟

❁❁❁

چھٹا باب

چچا فیروز نے سامنے پڑے ہوئے اتوار کے اخباروں کا انبار ایک طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''مومنہ بیٹی مینہ کا بیٹا منصور کیا کرتا ہے۔''

''چچا آپ نے پچھلے ہفتے بھی یہی سوال کیا تھا۔ خیریت تو ہے۔''

میں نے شاید زیادہ ہی حیرانی سے سوال کیا جس پر چچا نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے:

''بھئی ایک دفعہ پھر بتا دو زیادہ مشکل سوال تو میں نے نہیں کیا۔''

''چچا جان صاف بات یہ ہے کہ جب انسان تعلیم نہیں حاصل کرتا تو ہر ہتھکنڈے سے پیسہ کمانے کی مشین بن جاتا ہے۔ پھر اس کے دماغ کے لطیف خانے سب بند ہو جاتے ہیں اور وہ صرف دو جمع دو چار اور چار ضرب چار سولہ کا پہاڑا ہی پڑھتا ہے۔ یہی مینہ پھپھو کے تینوں بیٹے اور پھپھا جان کرتے ہیں۔''

''اوہو! کیا واقعی انہوں نے تعلیم کی طرف دھیان نہیں دیا؟''

''چچا آخر آپ کس تانے بانے میں الجھ گئے ہیں۔''

''چلو بیٹی آج تمہیں بتا ہی دیں۔ پچھلے ہفتے بھی احسن نے فون کیا تھا اور رات پھر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ شاید مینہ کے بہت زیادہ

اصرار پر حمیرا اور احسن تمہاری شادی کی بات منصور سے پکی کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''Oh! Never ever'' چچا جان بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو میری پڑھائی کے تین سال باقی ہیں پھر اس کے بعد سپیشلائزیشن کرنی ہے۔ اللہ جانے وہ میں کہاں سے کروں گی اور ویسے بھی منصور بھائی مجھ سے چودہ سال بڑے ہیں۔ ساتھ اس کے ان پڑھ اور جاہل نہ ڈھنگ کی بات کرنی آتی ہے نہ رہنے کا سلیقہ۔''

غصے میں جو منہ میں آیا کہتی گئی۔ نہ جانے غصہ مجھے امی ابو پر آ رہا تھا یا مینہ پھپھو پر جنہوں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات منوائی اور ابو کو تو وہ بہت آسانی سے بلیک میل کر سکتی تھیں کاش میرے پر ہوتے تو اسی وقت اڑ کر جاتی اور اپنا مقدمہ خود لڑتی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی اتنی بڑی دنیا میں میرے نصیب میں کیا مینہ پھپھو کا بیٹا ہی لکھا ہوا تھا۔ ابو نے بھی حد کر دی مجھے چار سال پرانا وقت یاد آ گیا جب میں نے میٹرک کیا تو دادی اور میں کوئٹہ مینہ پھپھو کے گھر گئے تھے۔ میں تو دو دن بعد ہی بور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ خالصتاً مردانہ ماحول تھا ان کے صرف تین لڑکے ہی ہیں۔ غالباً پھپھا جان بھی علم اور ادب آداب سے فارغ ہی ہیں اور بیٹے تو اور بھی سونے پہ سہاگہ۔ گالی گلوچ سے بھی گریز نہیں تھا۔ صرف پیسہ کمانا ہی تو زندگی کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ بقول دادی کے اچھا مطالعہ انسان کو انسان سے ایک اچھا انسان بنا دیتا ہے اور مطالعہ کا

ان کے گھر میں فقدان ہی نظر آیا۔ منصور بھائی کو تو مجھ پر سخت اعتراض تھا کہ میں تینوں بھائیوں سے گپ شپ کیوں نہیں لگاتی تھی۔ ایک تو تینوں عمر میں مجھ سے بڑے دوسرے سوائے فلموں اور فلمی شخصیات کے ان کی گفتگو کا کوئی اور موضوع ہی نہیں ہوتا تھا بھلا ایسے ماحول میں میری کیا جگہ؟ اس کے برعکس ابو کی شخصیت میں نے جن کے زیر سایہ پرورش پائی نہایت شائستہ اور خوشگوار حلیم الطبع اور منجھا ہوا ذوق رکھنے والے۔ امی کو بہت پیار سے بلاتے ہیں اور دادی کا بے حد ادب کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پاس بٹھا کر آرام سے سمجھاتے ہیں۔ پھپھو کے گھر آٹھ دن میں میری تو بس ہو گئی اور میں نے دادی کو واپسی پر مجبور کیا۔ پھپھو ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آئیں اور واپس جاتے جاتے دادی سے کہنے لگیں۔

''امی میری بات پر غور کرنا۔ مجھے جواب کا انتظار رہے گے۔''

دادی نہ جانے کیا جواب دیتیں کہ ٹرین نے رفتار پکڑی اور پلک جھپکتے میں کوئٹہ اور پھپھو مینہ اپنے اہل خانہ سمیت میری نظروں سے ہی نہیں بلکہ میرے ذہن سے بھی بہت دور ہو گئے۔ دادی کی طرف دیکھا تو گہری سوچ میں تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتی دادی بولیں۔

''بیٹی اب تو خوش ہو کل گھر پہنچ جاؤ گی۔'' اب میں سوچتی ہوں کہ اگر دادی زندہ ہوتیں تو شاید امی ابو کو کبھی بھی ایسا نہ کرنے دیتیں۔ غصے میں جلدی جلدی میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا مگر ایسی بے ڈھنگی بات

میرے ذہن سے کہاں نکلنی تھی۔ تھک ہار کر پاس ہی پڑی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی اور دادی کی ڈائری کھول لی۔ دادی کی قربت حاصل کرنے کا وہی ایک ذریعہ تھا۔ لکھا تھا:

وہ بھی کیا وقت تھا جب دہلی سے مسعودہ آپا آئی تھیں۔ وہ روتی جاتی تھیں اور اپنی بپتا آپا کو سناتی جاتی تھیں۔ کہنے لگیں۔ جب شملے سے مسلمانوں کی گاڑی لاہور کے لیے روانہ ہوئی تو سکھ کا سانس لیا کہ چلو گھر اور ساز و سامان گیا جانیں تو بچ گئیں۔ گاڑی میں سوار ہوتے وقت وہ اور ان کا ایک بھتیجا اور ایک بھتیجی ایک ڈبے میں بیٹھے اور بھائی بھاوج کسی دوسرے ڈبے میں۔ کہنے لگیں، قیامت کا سماں تھا مگر گاڑی چلی تو سوچا قیامت ٹل گئی۔ مسعودہ آپا ہمارے دور کے رشتے کی بہن تھیں مگر لاہور میں صرف وہ بڑی آپا کا گھر جانتی تھیں۔ اس لیے بغیر اطلاع دیے خود ہی بچوں کے ساتھ گھر پہنچ گئیں۔ بڑی آپا نے جب سوال کیا کہ بھائی بھاوج کہاں گئے؟ تو ان کی ہچکی بندھ گئی اور بولیں۔ جب ان کی ٹرین کالکا اسٹیشن سے ذرا آگے بڑھی تو چلتی گاڑی میں ہندو سکھ گھس آئے اور جو ہاتھ آیا اسے گھسیٹ کر گاڑی سے باہر پھینک دیا کوئی کہاں گرا کوئی کہاں گرا۔ مسعودہ آپا کی آواز میں درد بڑھتا جا رہا تھا جوں جوں وہ اپنا دکھ بیان کر رہی تھیں انہوں نے بتایا کہ ان کے سامنے پہلے چنو کو چلتی گاڑی سے باہر پھینکا پھر فریدہ کو اور مسعودہ آپا کو پہاڑی علاقہ تھا لوگ بھی لڑھک پھڑک کر جانے کتنے فاصلے پر گرے تھے کہنے لگیں جب

انہیں ہوش آیا تو انہوں نے حواس قابو میں کر کے ہمت کی اور لاشوں کو پھلانگتی، ان کے منہ سیدھے کر کر کے دیکھتی اپنے بھائی کے بچوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئیں۔ تینوں چوٹوں سے نڈھال بڑی مشکل سے کسی ٹیلے کی آڑ میں دم لینے کو بیٹھ گئے کہ بھائی اور بھابی ان کی تلاش میں شاید ادھر نکل آئیں گے جنگل کے سناٹے میں دھیمی دھیمی آہوں کے سوا اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ دور دور کوئی گاؤں بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ رات پڑ گئی اور یہ تینوں زخموں سے نڈھال اور تھکن سے چور جہاں بیٹھے تھے وہیں سو گئے۔ سورج جب سر پر آ گیا تو آنکھ کھلی۔ ہمت کر کے قریب ہی ایک درخت کی چند ناشپاتیاں توڑیں دونوں بچوں کو کھلائیں اور خود بھی کھا کر بھائی بھابی کی تلاش میں چل پڑے۔ گاڑی کی پٹڑی کے ساتھ چلنا خطرناک تھا۔ دور سے ٹرین آتی اور یہ تینوں چھپ جاتے۔ پورے ایک دن کی تلاش کے بعد بھی جب انہیں ڈھونڈنے میں ناکامی ہوئی تو مسعودہ آپا کو خیال آیا کہ بھوک اور پیاس سے پہلے بچے مریں گے اور پھر وہ خود لہٰذا فیصلہ کیا رات کو گاڑی کی لائن کی سمت مگر اس سے ذرا ہٹ کر سفر کیا جائے اور دن کو کہیں چھپ کر سو جائیں۔ جنگلی انار، کسمل اور ناشپاتیاں ان دنوں درختوں پر خوب لگے تھے۔ انہیں سے بھوک اور پیاس بجھائی۔ تیسری رات گزرنے کے بعد تھک ہار کر سونے کے لیے جگہ صاف کر رہے تھے تو کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ مسعودہ آپا کہنے لگیں کہ ان کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر ہی رہ گیا جب صبح صادق کے

اندھیرے میں ایک پنڈت جی کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ بولے۔

''بیٹی دو بالکوں کے ساتھ کہاں سے آئی ہو اور کہاں جا رہی ہو۔''

نہ جانے وہ خود یا بچے کیا بولتے کہ پنڈت جی نے خود ہی یہ کہہ کر مسئلہ حل کر دیا۔

''یہاں تو تمہیں انسان اور جانور دونوں کا خطرہ ہے۔ میرے گھر چل کر ذرا دم لے لو۔ بیٹی ڈرو نہیں دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں۔''

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہے یہ سوچ کر وہ تینوں ان کے ساتھ چلے گئے مندر سے ذرا دور ایک گھر سے باہر ایک کوٹھری میں ان تینوں کو ٹھہرایا۔ منہ ہاتھ دھونے کو پانی لائے اور کچھ دیر بعد سبزی کی ترکاری اور پوریاں کھانے کو لے آئے۔ انہوں نے سوچا ایک وہ درندے تھے جنہوں نے ان کو پھینکا تھا اور ایک یہ فرشتہ صفت انسان جو کہ انہیں کی قوم سے تھا۔ پھر مسعودہ آپا بولیں کہ انہوں نے وہ سبزی اور پوریاں کھا لیں تو پنڈت جی بولے۔

''بیٹی تمہارا سفر بہت لمبا ہے اور اس لیے میں تم منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکو گی۔ آج سے اپنے نام ہندوانہ رکھو تم اور پتری ساڑھی پہنو اور بالک کو دھوتی پہناؤ۔ پنڈت جی نے مسعودہ کو لیلا فریدہ کو شانتی اور چنو کو گوپال بنا دیا۔ کپڑے لا کر دئے اور ماتھے پر بندیاں لگائیں اور بولے۔

''بھگوان کی کرپا سے تم لوگ صحیح جگہ پر آئے ہو۔ کچھ دن ذرا

ٹرین کے واقعہ کو گزر جانے دو۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا پھر کچھ کریں گے۔''

خدا جانے وہ کس کا گھر تھا جس کے پاس یہ کوٹھری تھی اور یہ کوٹھری کس مقصد کے لیے بنی تھی کیونکہ آٹھ دن وہ وہاں رہے لیکن کسی نے انہیں نہیں دیکھا نہ ہی وہاں سے کوئی گزرتا تھا ویسے پنڈت جی نے باہر نکلنے سے انہیں منع کیا ہوا تھا۔ وہ بولیں:

''آٹھ دن جیسے تیسے کر کے گزر گئے۔'' اور پنڈت نے مسعودہ آپا کو ایک دن ایک خط دے کر کہا کہ فلاں گاؤں وہاں سے کچھ گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہ تینوں پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے ہندوؤں کے روپ میں وہاں چلے جائیں اور وہاں کے مندر کے پنڈت کو وہ خط دے دیں۔ صبح صادق کو یہ لوگ نکلے اور پانچ گھنٹے متواتر چلتے وہاں پہنچ گئے۔ مندر ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور پنڈت کو انہوں نے خط دے دیا۔ پنڈت جی نے جب خط دیکھا تو ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دوسرے دن ایک بندہ ساتھ کر کے دہلی کی بس پہ بھیج دیا کہ انہیں جواہر لال نہرو تک پہنچایا جائے۔ اس پنڈت نے بھی اپنا خط ساتھ دے دیا۔ مسعودہ آپا کو یہ پلان کچھ کھٹکا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ دہلی پہنچ کر بس سے اتر کر ٹانگا پکڑا اور یہ چاروں نہرو کے دفتر پہنچ گئے۔ ان تینوں کو برآمدے میں بٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کا بلاوا بھی آ گیا اور کچھ سوال جواب کے بعد نہرو نے اسی بندے سے کہا۔

''آج جو ہوائی جہاز لاہور جا رہا ہے اس میں انہیں بٹھا دو اور اس لڑکے کو

دوسرے کپڑے خرید کر دو۔'' پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔ ''اور آپ دونوں بندیاں اتار دینا۔'' اس طرح مسعودہ آپا لاہور پہنچ گئیں۔ مگر ان کا رونا نہیں بند ہو رہا تھا۔ بولیں:

''جب نہرو نے جہاز کا کہا تو جی چاہا ان کے قدموں میں سر رکھ دوں لیکن فوراً میرے ایمان نے دستک دی کہ یہ تو اللہ کی مشیت پوری کرنے کے لیے ایک کارندہ ہے شکر اس خدا کا کر جس نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور تیری مشکل آسان کی۔''

آٹھ دن مسعودہ آپا ہمارے پاس ہی رہیں روزانہ سرور بھائی مہاجروں کے کیمپوں میں جاتے کہ ان کے بھائی اور بھابی کو تلاش کریں مگر بے سود واپس منہ لٹکائے آ جاتے۔

مہاجروں کے حالات سن کر میں سوچتی کہ حسن ماموں تو کہہ رہے تھے کہ پاکستان خوشحال ہو گا مگر یہاں تو پہلے سے بھی زیادہ زبوں حالی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ خیر کچھ دنوں بعد مسعودہ آپا کے چھوٹے بھائی کا خط کراچی سے آیا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا تھا کیونکہ وہ حکومتِ برطانیہ کا ملازم تھا۔ پورے دفتر کے مسلمانوں کو سپیشل ٹرین میں بحفاظت کراچی پہنچایا گیا تھا اور مسعودہ آپا بھی چلی گئیں۔

آئے دن ہندوستان سے آنے والوں کی داستانیں سن کر اپنا تو مجھے ہوش ہی نہ رہا۔ شکر ہے ملتان سے خوشنودہ آ گئی۔ ذرا ماحول میں تبدیلی

آئی۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتی کہ میں اصغر کے ساتھ کتنی خوش ہوں۔ میں اسے کیا بتاتی کہ جس شخص سے میری شادی ہوئی ہے اس کے زندہ وجود کے چاروں طرف مجھے اپنی پیاری سی شنو آپا کی لاش دکھائی دیتی ہے۔ ایسے ساتھی کے ساتھ کیا میری سہاگ رات اور کیا میری عید شبرات۔ ذہنی مناسبت بھی نہیں اور عمروں کا تو فرق ہے ہی۔ لیکن اس کا منہ بند کرنے کے لیے میں کہہ دیتی۔ ''خوشنودہ پہلے ہی پتا تھا ایسا ہی ہوگا۔ بس ٹھیک ہے۔ بچوں کی زندگی تو سنور جائے گی۔''

اصغر کی تبدیلی لاہور ہوگئی اور کچھ دنوں بعد میو گارڈن میں اصغر کو گھر مل گیا۔ حسن ماموں ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ محل نما گھر تھا آگے پیچھے برآمدہ چاروں طرف خوب کھلی زمین، کچھ لان اور کہیں زبزی کا کھیت۔ ایک عدد نوکر بھی ملا جس کا الگ کوارٹر تھا۔ کاش شنو آپا ہوتیں اور یہ بہار بھی دیکھتیں۔ دو ماہ بعد احسن پیدا ہوگیا۔ میں بہت کمزور ہوگئی اور بڑے بچوں کو زیادہ توجہ نہ دے سکتی تھی منزہ تو شاید ٹھیک ہی تھی مگر فیروز اور مینہ بہت ستانے لگ گئے۔ خواہ مخواہ اصغر سے میری شکایتیں کرنی شروع ہو گئے۔ اصغر سے تو خیر ویسے بھی میری کوئی گپ شپ نہیں تھی وہ بچوں کی باتوں میں آ کر مجھ سے آئے دن جھگڑا کھڑا کرتے رہتے۔ ایک دن تو فیروز نے کسی ایرانی قالین پر سیاہی کی بوتل گرادی۔ پھر کیا تھا فیروز کو تو جو کہا بیان سے باہر ہے۔ جب اس کی صفائی میں میں نے کہا کہ ''بچہ ہے غلطی ہوگئی معاف کردیں۔''

تو مجھے زور سے ایک طرف دھکا دے کر بولے:

''تم نے ان بچوں کو بگاڑا ہے ابھی اس گھر سے چلی جاؤ میں خود اپنے بچے سنبھال لوں گا۔'' میرے تو سر پر نہ آسمان رہا نہ پیروں تلے زمین۔ خاموشی سے وہاں سے کھسک گئی اور اس واقعہ کے بعد اصغر کے سامنے بچوں کی وکالت کرنی چھوڑ دی۔ اس سے فیروز اور مینہ بدظن ہونے لگ گئے کہ میں اب احسن کو زیادہ چاہتی ہوں اور ان کا خیال نہیں ہے مجھے۔ اس مسئلے کا کسی کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایسے حالات میں ایسا ہی ہونا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اصغر کے حقوق میں کہیں بھی میں نے دراڑ نہیں پڑنے دی لیکن شاید اس میں انس، محبت اور اپنائیت کی چاشنی ڈالنے میں شاید میں ناکام رہی اور اصغر جیسے جہاندیدہ انسان نے یہ محسوس بھی کرلیا ہوگا۔ لیکن اس میں میرا قصور بھی کیا تھا۔

ایک دن میں بڑی آپا کے گھر گئی ہوئی تھی کہ سرور بھائی آئے اور بولے: ''آج میں بچوں کی فیس جمع کرانے گیا تو حسن ماموں مل گئے انہوں نے بتایا کہ ان کے بوڑھے ماں باپ اور دو عدد بھائی کسی کی شادی میں پٹیالہ گئے ہوئے تھے وہاں رشتہ داروں نے روک لیا اب سننے میں آرہا ہے کہ وہاں بھی فساد شروع ہوگیا ہے اور کپورتھلہ، پٹیالہ اور الور میں تو فوج کے ساتھ مل کر بہت منظم طریقے سے مسلمانوں کو بے عزت کر کے مارا جاتا ہے۔''

آپا بڑی حیرت سے بولیں۔

''سرور کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا سیدھی لائنیں بنوا کر گولی مار دیتے ہیں۔''

''اوہو! عقل سے کام لو۔ وہ لوگ پہلے سے کوئی جگہ مقرر کر لیتے ہیں اور معصوم مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ فلاں ٹرین انہیں خیریت سے پاکستان چھوڑ دے گی اور جب اس جگہ ٹرین پہنچتی ہے تو اسے روک کر لوٹ لیتے ہیں عورتوں کی بے حرمتی اور قتل کرتے ہیں اور لاشوں سے بھری ٹرین پاکستان پہنچتی ہے۔''

''ہائے سرور! یہ تو فرعون سے بھی زیادہ ظالم ہو گئے۔''

''ہاں! بھئی ایک خبر اچھی ہے کہ قائداعظم لاہور آ گئے ہیں اور انہوں نے مہاجرین کا مسئلہ اپنے کاموں میں سرفہرست رکھا ہے اور ایک فنڈ قائداعظم ریلیف فنڈ کے نام سے کھول دیا ہے۔ میں بھی اس میں پانچ روپے ڈال آیا ہوں۔'' آپا بولیں۔

''سرور بہت اچھا کیا تم نے اسی شاہ دلی سے سب صاحب حیثیت لوگ دینے لگے تو ان شاء اللہ مہاجرین کو بسانے میں آسانی ہو جائے گی۔''

''بھئی خانم آئی ہوئی ہے کوئی چائے وغیرہ تو پلاؤ۔ کل کی بارش سے موسم اچھا ہو گیا ہے اگر پکوڑے بھی ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے۔''

آپا کا موڈ اسی وقت شاید سیاسی بنا ہوا تھا۔ بولیں:

''سرور دیکھو نا کشمیر، پٹیالہ اور جونا گڑھ تو ان جگہوں میں سے ہیں

جہاں یا تو عوام کی اکثریت مسلمان ہے یا سربراہ مسلمان ہے۔ تو پھر وہاں ہندو کیسے غدر مچا سکتا ہے اور دیکھو نا کئی سو سال سے یہ دونوں قومیں اکٹھی رہ رہی ہیں۔'' سرور بھائی بولے۔

''بیگم اکٹھے رہنا ان کی مجبوری تھی کیونکہ حکومت جو مسلم بادشاہوں کی تھی۔ جیسے ہی انگریز کی شہ انہیں ملی ان کی اصلیت سامنے آ گئی۔''

''ہاں! سرور ٹھیک ہی کہتے ہو برہمنوں نے تو مسلمانوں کو ہمیشہ پلید ہی سمجھا۔ ایک برتن تو کیا ایک نل سے پانی بھی نہیں پیتے تھے بلکہ انہیں ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہ تھا اور ہمارے پیارے نبیؐ تو ہمیں مساوات کا سبق دے کر گئے ہیں ہم وہ ظلم نہیں کر سکتے جو یہ کرتے ہیں۔ خیر مسلمانوں کے لیے دعا ہی کرنی چاہیے۔''

''بیگم کچھ کھانے کو بھی دو گی یا سیاست ہی کیے جاؤ گی۔''

''میرے خیال سے چائے کو چھوڑیں، ادھ رڑکا بنا کر لاتی ہوں کل ہی میں نئی مدھانی لائی ہوں۔''

''چلئے آپ خوش ہو جائیں۔ ادھ رڑکا ہی سہی۔''

آپا دس منٹ میں ادھ رڑکا بنا کر لے آئیں اور سرور بھائی بولیں:

''سرور آپ کو میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ جب آپ برف لاتے ہیں اچھی طرح بوری میں لپیٹ دیا کریں۔ دو کلو کی ایک پاؤ ہی رہ گئی ہے۔''

''اچھا حضور آئندہ خیال رکھیں گے۔'' سرور بھائی نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گئے۔

بچے اور میں گھر پہنچے تو اصغر دفتر سے آ چکے تھے ہمیں دیکھتے ہی بہت غصے سے کہنے لگے:

''خانم یہ کیا؟ تم نے روز روز آپا کے گھر جانا شروع کر دیا ہے۔ کیا بات ہے اپنے گھر میں دل نہیں لگتا۔ اگر ایسا ہے تو وہیں جا کر رہ لو۔''

خاموشی سے میں نے برقعہ اتارا اور بچوں کے کمرے میں چلی گئی اور سوچتی رہی کہ گھر میں سوائے ذمہ داریوں کے میرے لیے دل لگانے والی بات ہے بھی تو نہیں۔ اصغر سے اگر کوئی بات کروں تو یوں لگتا ہے کہ وہ مجھے نا سمجھ جان کر بات ٹال جاتے ہیں اور انہوں نے اپنی طرف سے تو کوئی موضوع چھیڑنا ہی نہ ہوا۔ اگر ہفتے پندرہ دن میں آپا کے گھر چلی جاؤں تو کہتے ہیں یہ روز روز کا جانا ہو گیا۔ اگر ہمساؤں کی بیویوں سے ملنا چاہوں تو وہ بھی میرے لیے منع ہے۔ لگتا ہے گھٹ کر ہی مر جاؤں گی۔

یہاں تک پڑھا اور میں نے ڈائری میز پر رکھی اور زور زور سے کرسی کو ہلانے لگی۔ دادا پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ ایک تو دادی نے ان سے شادی کی اور بجائے اس کے کہ دادا ان کے شکر گزار ہوتے اور دادی کی عزت کرتے۔ الٹا ان کو ڈانٹ دیا۔ بھلا دادی کیوں اتنی بے بس بنی رہیں۔ کالج میں ہی داخل ہو جاتیں۔ پڑھنے کا شوق تو پورا کر لیتیں۔ مگر شاید دادا نے

جانے ہی نہیں دینا تھا۔ ہائے! میری پیاری دادی کہہ کر شاید کرسی ہلاتے ہلاتے میں سو گئی۔ چچی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کوئی جواب نہ پا کر اندر آ گئیں۔ دروازے کی آواز سے میں اچانک جاگ گئی اور میرے منہ سے نکلا۔ ''دادی آپ بھی بڑی ڈرپوک ہیں۔''

''بھئی میں تمہاری چچی ہوں اور ڈرپوک ورپوک میں ہرگز نہیں ہوں۔''

''سوری چچی میں شاید خواب میں بول رہی تھی۔''

''مومنہ آج ہم نے مال آف امریکا دیکھنے جانا ہے تیار ہو جاؤ۔''

''کیوں چچی روز ہی تو کسی نہ کسی مال میں جاتے ہیں اس میں کیا خاص بات ہے۔''

''بھئی دیکھو گی تو پتا چلے گا۔''

چچا کے گھر سے تقریباً ایک گھنٹے کا راستہ طے کرنے کے بعد ہم نے ہائی وے سے جو سڑک بدلی تو یوں لگا سامنے ایک پورا شہر ہی چھت کے اندر بسا ہوا ہے۔ اونچے اونچے راستوں کو کاٹتے ہوئے گاڑی پارک کرنے کی جگہ پہنچے تو میں حیران ہی رہ گئی۔ کئی منزلہ عمارت صرف گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے۔ چچی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تقریباً تیرہ ہزار گاڑیاں پارک کی جا سکتی ہیں وہاں! بھئی واہ! مزا آ گیا۔ چچی بولیں کہ یہاں سے مال کے جس حصے میں جانا چاہیں لفٹ کے ذریعے جا سکتے ہیں یا پھر پارک کرنے کی عمارت

کو مال سے ملانے کے لیے جگہ جگہ جو پل بنے ہیں ان سے داخل ہو سکتے ہیں...... میں نے پوچھا۔

''چچی آخر یہ اندر سے کتنا بڑا ہے؟'' وہ بولیں:

''یہ سارا کا سارا اٹھتر ایکڑ پر بنا ہوا ہے پچھلے سال ہی مکمل ہوا ہے۔''

اندر داخل ہوتے ہی اس عظیم الشان عمارت کی پلاننگ، سجاوٹ اور بڑائی نے بہت ہی متاثر کیا۔ داخل ہونے کے بے شمار راستے مال کی کئی منزلیں اور ہر منزل کی اپنی ہی شان اوپر نیچے جانے کے لیے بے شمار سیڑھیاں اور ایسکلیٹر اور بڑی بڑی شیشے کی دیواروں والی لفٹیں۔ بہت بڑے بڑے بلڈنگ کے سیکشن جو کہ گنبد نما چھتوں سے آراستہ جن میں سے روشنی اور دھوپ ماحول کی خوشگواری میں اضافہ کر رہی تھی اور درخت اور پھول کیا ہی کسی باغ میں ہوں گے جو اس چھت کے اندر لگے تھے۔ میں نے چچی سے پوچھا۔

''چچی اس سب کا بندوبست چلانے کے لیے کافی عملہ چاہیے ہوتا ہوگا؟''

''ہاں! بھئی سب سلسلۂ چلانے کے لیے دکان داروں کو چھوڑ کر تقریباً بارہ ہزار ملازمین یہاں کا بندوبست کرتے ہیں۔''

میں نے سوچا پودوں کی دیکھ بھال اور کئی میل گھوم پھر کر بنی ہوئی راہ داریوں اور دلانوں کو صاف رکھنے کے لیے ہی اچھے خاصے عملے کی

رت ہوتی ہوگی تا کجاہ باقی سارے کام۔

ہم چلتے جا رہے تھے اور میری آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں کئی کئی
بس تو امریکہ کے بڑے سٹوروں نے ہی قابو کر رکھی تھیں جیسے لیسٹز، میسی،
نڈیل اور نوڈسٹر روم جیسے مہنگے اور اعلیٰ اسٹور۔ تیسری دنیا کے لوگ تو اس
وشوکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ڈزنی ورلڈ کے علاقے میں گئے تو نکلنا
نکل ہو گیا۔ ایک ایک چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اسی چھت کے نیچے
بڑا ایک تفریحی پارک تھا بچوں کے لیے جس میں رولر کوسٹر، پانی کی نہر
س میں کشتی، آبشار، ریل گاڑی اور عجیب طرح کے جھولے۔ تین چار
وران، ایک بڑا سا لیگو لینڈ جس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے لاکھوں لیگو
ے ہوئے اور چچی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ صرف بچوں کی تفریح گاہ سات
کے رقبے میں ہے۔ میں نے سوچا شاید گلبرگ کا لبرٹی اتنا بڑا ہوگا اور مال
سری منزل پر بے شمار سینما ہال تھے اور بڑوں کے لیے تفریحی سہولتیں جس
ڑے بڑے ہالوں میں کمپیوٹر کے کھیل۔ بے شمار بڑے بڑے ٹی وی اور
بڑے بلیئرڈ روم۔ چل چل کے ٹانگیں ہی دکھنے لگ گئیں۔ شکر ہے چچی
نے کا خیال آیا اور ہم دوسری منزل پر چلے گئے جہاں بہت سارے
ران تھے۔ کھانا بھی کھایا اور آنے جانے والوں کو دیکھتے رہے۔ ملک
ل خوب خوشی خوشی پیسے خرچ رہے تھے۔ چچی بولیں
میں موسم خوشگوار ہی رہتا ہے۔ حالانکہ اتنا بڑا ہے لیکن

ٹمپریچر ایک جیسا ہے نہ گرمی لگتی ہے نہ سردی۔ تقریباً چار کروڑ لوگ یہاں سیر کرنے آتے ہیں۔

''اوئے! یہ تو بہت بڑی تعداد ہے۔''

''ہاں بھئی اس کے اردگرد بے شمار ہوٹل بن گئے ہیں ملا جلا کر تقریباً سب کے کمرے سات ہزار بنتے ہیں۔ خیر چلو اب اس کا دوسرا ونگ دیکھتے ہیں۔''

''چچی ابھی اور کتنا باقی رہ گیا ہے۔''

''ارے تم تھک گئیں۔ یہاں تو پانچ سو بیس دکانیں ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے ابھی اور چلنا پڑے گا۔'' اور میں نے شکر کیا کہ میں جاگر پہن کر گئی تھی۔

❁❁❁

ساتواں باب

جانے میں دن بہت کم رہ گئے تھے سو چا دادی کی ڈائری کے آخری صفحے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالوں کمرے کا دروازہ بند کیا اور آرام سے بستر پر لیٹ کر پڑھنا شروع کیا، لکھتی ہیں:

''قائداعظم کی وفات پر تو میں نے اصغر کو بھی اداس دیکھا جبکہ وہ کبھی بھی اپنے جذبات کا اظہار برملا نہیں کرتے تھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مسلمانوں کی کشتی کہیں سنبھلنے سے پہلے ہی پھر سے نہ ڈولنی شروع ہو جائے۔ اسی دن حسن ماموں بہت یاد آ رہے تھے وہ حالات پر صحیح تبصرہ کیا کرتے تھے۔ خیر میں بچوں کی کتابوں پر اخبار کے کاغذ سے کور چڑھا رہی تھی۔ اتنے میں سرور بھائی اور آپا آ گئے۔ نکو شکنجبین بنا کر لے آیا اور بچوں کو ہدایات دے کر ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سرور بھائی اور آپا راستے میں شاید کوئی بحث کرتے ہوئے آئے تھے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی بھائی جان آپا سے مخاطب ہوئے:

''ہاں! تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ قائداعظم نے آخری دم تک انگریزوں کو یادداشتیں لکھیں کہ یو این او کے وعدوں کے مطابق حیدرآباد، کشمیر اور جونا گڑھ اور الور رائے شماری یا پھر سربراہوں کے مشورے سے پاکستان یا ہندوستان میں شامل کی جائیں گی مگر قائداعظم کو بالکل نظر انداز

کر کے پچھلے ہی سال نومبر میں بیس ہزار لبریشن آرمی جونا گڑھ میں داخل ہوئی اور مسلمان عوام تو وہاں سے بھاگے سو بھاگے وہاں کا نواب بھی جان بچا کر بھاگا۔"

"سرور عام آدمی تو صعوبتیں برداشت کر سکتے ہیں۔ نوابوں بیچاروں کے لیے یہ مشکلات کا سامنا کرنا بڑا دوبھر ہوتا ہوگا۔"

"کمال کرتی ہو حیدر آباد دکن تو سمجھو ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ نواب عثمان علی خان کی اپنی فوج تھی، اپنی ریلوے، اپنا سکہ اور اپنے ڈاک کے ٹکٹ تھے۔"

آپا بولیں: "سرور ریاست تو اب بھی ہے آپ "تھے" کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہاں بھی ہندوستانی فوج نے داخل ہو کر بزورِ طاقت تختہ الٹ دیا ہے اور نظام سے زبردستی ہندوستان سے الحاق لکھوالیا ہے۔"

"ہاں سرور اب قائداعظم کے بعد تو ہندو کو کھلی چھٹی مل گئی۔ پاکستان کی بنیادیں کمزور کرنے کے لیے۔ اللہ خیر ہی کرے۔"

ڈائری بند کر کے میں سوچنے لگی کہ واقعی اس زمانے سے اب تک پاکستان اندرونی اور بیرونی سازشوں کا ہی مقابلہ کر رہا ہے۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان کا آئین قرآن ہوگا لیکن سیاست دان ابھی تک وہی نافذ نہ کر سکے۔ آئے دن اقتدار کی ہوس میں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور اس کی وجہ سے

ملک تنزل کی طرف ہی جا رہا ہے حکومت بدلتی ہے تو پچھلی حکومت کے اچھے کام بھی ملیا میٹ کر دیے جاتے ہیں۔ عوام دن بدن غریب اور بددل ہوتے جا رہے ہیں جس کے نتیجے میں غنڈہ گردی، رشوت خوری اور بے ایمانی شاید جائز سمجھی جانے لگی ہے۔ قوم ترقی اور دفاع جیسے اہم شعبے بیرونی ملکوں کے قرضوں کے بل پر چل رہے ہیں۔ سنجیدگی سے سوچوں تو دل ہی بیٹھنے لگتا ہے لیکن دادی کی ڈائری میں لکھی ہوئی حسن ماموں کی بات بہت دل کو لگی اور سہارا بھی دیتی ہے کہ "یہ ملک معجزاتی طور پر بنا ہے اور معجزہ ہی اسے قائم رکھے گا اور معجزہ صرف اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔"

"میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ میاں میرا پیارا ملک جیسا بھی ہے اسے قائم اور دائم رکھنا۔" آگے دادی نے لکھا ہے:

سرور بھائی کو ریٹائرمنٹ مل رہی تھی اور مستقل رہائش کے لیے وہ ملتان جانے کے لیے سامان باندھ رہے تھے۔ میں بھی اکثر مدد کے لیے چلی جاتی تھی ایک دن میں وہاں گئی ہوئی تھی تو خیال آیا کہ بہت عرصے سے نہ حسن ماموں دکھائی دیے نہ ہی ان کا کوئی ذکر ہوا۔ میں نے ان کے بارے میں سرور بھائی سے پوچھ ہی لیا تو وہ بولے:

"اوہو خانم کیا قصہ چھیڑ دیا تم نے۔ وہ تو بے چارے پاگل ہو گئے ہیں اور مجھے پاگل خانے انہیں داخل کروانا پڑا۔"

"ہیں ماموں جان! میری آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔"

آپا بولیں: ''ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا یہی حال ہونا تھا۔''

''بھئی آخر انہیں ہوا کیا؟''

سرور بھائی نے پیٹی میں تالا لگایا اور زمین پر ہی بیٹھ گئے۔ بولے:

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ پٹیالہ میں ان کے ماں باپ اور بھائی لا پتا ہو گئے تھے۔ جب کچھ بھی خبر نہ ملی تو شاید انہوں نے صبر کر لیا ہوگا۔ مگر تقریباً تین سال ہوئے انہیں اپنا ایک خالہ زاد بھائی بھیک مانگتا ہوا ملا مگر آنکھوں سے اندھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اندھا نہیں تھا اور تاریخ میں اس نے ایم اے کیا ہوا تھا۔ خیر وہ اسے گھر لے گئے تو اس نے بتایا کہ جب پٹیالہ میں فساد شروع ہوئے تو حسن ماموں کے والدین اور بھائی بھی دیگر خاندان کے ساتھ ایک ٹرک میں بیٹھ کر سرحد پار کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں بلوائی آ گئے اور انہوں نے پہلے خواتین کو ان کے مقدس رشتوں کے سامنے بے آبرو کیا اور پھر قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد مردوں کو گالیاں دیتے جاتے اور قتل کرتے جاتے۔ ماموں کے خالہ زاد نے احتجاج کیا تو ایک بلوائی نے کہا۔ ''اس کو زندہ چھوڑ دو اور آنکھیں نکال کر سرحد پار کرا دو۔ یہ سالا پاکستان پہنچ کر بھی پاکستان نہ دیکھ سکے گا۔'' وہ اندھا تو بے چارہ شاید فوت ہو چکا ہے مگر حسن ماموں بے چارے آہستہ آہستہ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔''

''سرور بھائی آپ نے ماموں کا علاج کیوں نہ کروایا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے میں انہیں اس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ ضرور

کروایا مگر ڈاکٹر کہنے لگے کہ ان کے دماغ کی بیٹری ہی ختم ہونے کو ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں؟''

''ویسے وہ ہیں کس حال میں؟''

''بس زیادہ تر تو خاموش ہی رہتے ہیں، کھانے کو دے دو تو کھا لیتے ہیں نہ دو تو پروا بھی نہیں کرتے اور جب دورہ پڑتا ہے تو جو بھی سامنے آئے اس کا گلا دبوچ لیتے ہیں۔ چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے اور چلاتے ہیں نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' میرے منہ سے نکلا اور بے اختیار ایک کپکپاہٹ کے ساتھ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ گھر آ کر بھی کئی دن تک روتی رہی۔ ایک تو بے چارے بے سہارا مہاجرین کی حالت سن سن کر جینا دوبھر ہو گیا تھا دوسرے اصغر کا غصہ کبھی کبھی تو گھر چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کرتا تھا۔ لیکن پھر میں سوچتی کہ شاید اصغر کو بھی میری شنو آپا سے بہت پیار ہوگا اور ان کی جدائی نے اصغر کو ایسا کر دیا ہے۔ اگر کبھی اچھا موڈ دیکھ کر میں نے پوچھنے کی جرأت بھی کی تو کبھی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ کبھی ان کے وحشیانہ غصے کی طرف ان کا دھیان لگاتی تو کہتے:

''تم لوگ حرکتیں ہی ایسی کرتے ہو کہ مجھے آگ لگ جاتی ہے۔''

ایک دن بچے امتحانوں سے فارغ ہوئے تو میں ان کے ساتھ کیرم بورڈ کھیلنے بیٹھ گئی۔ کھیل خوب گرما گرمی کا ہو گیا اور بچوں کے ساتھ میں بھی

چیخوں اور شور میں شامل ہوگئی۔ کھیل کا سارا مزا دھرا کا دھرا رہ گیا جب اصغر ساتھ والے کمرے سے اپنا جوتا ہاتھ میں لیے غیض وغضب کے ساتھ نمودار ہوئے۔ بچوں کی خوب ٹھکائی کی اور مجھے بھی کافی کہہ سن کر کیرم بورڈ الٹ دیا۔ بچے تو بے چارے روتے دھوتے کمرے میں چلے گئے اور میں بھی دلبرداشتہ خون کے آنسو چھپاتی ہوئی وہاں سے کھسک گئی۔ کافی دیر سوچتی رہی کہ اس بندے کا آخر مسئلہ کیا ہے۔ اسی طرح کے واقعات میری زندگی کا معمول بن گئے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کب اور کس بات پر اچانک اصغر کا پارہ آسمان پر چڑھ جائے گا۔

مینہ کی شادی پر تو اس قدر بدمزگیاں ہوئیں کہ اس کی رخصتی کے بعد شاید آدھی رات تک میں شکرانے کے نفل پڑھتی رہی۔ شادی کے پورے تین دن اصغر کا پارہ ساتویں آسمان پر رہا اور قدم قدم پر آجا کے شامت میری ہی آتی۔ مینہ کی خواہش کا خیال رکھتی تو اصغر کے اصولوں کو زٹ پہنچتی اور اگر مینہ کی خوشی اور خواہش کو نظر انداز کرتی تو وہ رونا دھونا شروع کر دیتی۔ خیر کچھ اصغر کی رضامندی سے اور کچھ ناراضگی سے مینہ کو تو جہاں تک ہو سکا میں نے خوش ہی باپ کے گھر سے رخصت کیا اور اس کی شادی کے تین سال بعد ہی منزہ کی شادی بھی کر دی مگر افسوس کہ کچھ مہینوں بعد فیروز امریکا چلا گیا اور صرف احسن ہی گھر میں رہ گیا..... اسی دوران اصغر کی تبدیلی کراچی ہوگئی اور کراچی میں اصغر کو جو گھر ملا اس میں بہت بڑے بڑے املی کے درخت تھے جو

مجھے اکثر شنو آپا کی یاد دلاتے تھے۔ وہ املی بہت شوق سے کھایا کرتی تھیں۔ گھر کی شان وشوکت دیکھ کر میں اکثر سوچتی کاش شنو آپا زندہ ہوتیں تو کتنا خوش ہوتیں اور اب تو شنو آپا کے ساتھ مجھے بڑی آپا اور ان کے ساتھ گزرا ہوا وقت بہت یاد آتا جب ہم کراچی آئے انہیں فوت ہوئے اس وقت چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اصغر کی تو ہمیشہ سے ہی اپنی علیحدہ مصروفیات رہیں۔ احسن بھی اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا اور میں سوچتی تھی کہ شنو آپا کے بچے تو خیر سے اپنے اپنے گھر کے ہوئے۔ مجھ سے جو بن پڑا میں نے کر لیا۔ میری زندگی کا مشن پورا ہو گیا اگر اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے تو میرا روز روز کا مرنا اور جینا تو ختم ہو جائے گا اور میری روح کو شاید سکون مل جائے۔ مگر خدا کو اس معاملے میں کسی کی دخل اندازی بالکل منظور نہیں۔ اس لیے شاید موت کی تمنا کرنی بھی گناہ ہے۔ احسن نے جب میٹرک کیا تو اس کا رزلٹ سن کر اصغر خوش تو بہت ہوئے مگر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولے:

''بیٹا اب تو نہ کہیں امریکا چلے جانا۔'' پہلی دفعہ میں نے اصغر کے لہجے میں نرمی اور انکساری دیکھی لیکن افسوس کہ احسن کے انجینئر بننے میں ابھی ایک سال باقی تھا کہ اصغر دل کے عارضے میں کچھ دن بیمار ہوئے اور مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات پر فیروز نہ آسکا لیکن فون پر بہت مجبور کرتا رہا کہ میں اور احسن امریکا چلے آئیں۔ مجھے منزہ اور مینہ کے خیال نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اب شکر کرتی ہوں کہ میں امریکا نہیں گئی۔ پڑھائی سے

فارغ ہو کر احسن کو اچھی نوکری مل گئی اور جلد ہی میں نے حمیرا سے اس کی شادی کر دی اور احسن کی نوکری کی وجہ سے پھر لاہور آ گئے۔

جب احسن کی بیٹی مومنہ پیدا ہوئی تو اچانک ایک خوشی کی کرن میرے وجود میں سرایت کر گئی اور مجھے زندگی میں شاید پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ جو لوگ دنیا میں واقعی خوش ہوتے ہیں انہیں کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ اچانک دل میں خواہش اٹھی کی مومنہ کو دیکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ مجھے بہت لمبی عمر دے۔

یہاں تک پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب الفاظ بھی صاف نظر آنے بند ہو گئے تو ڈائری بند کر کے میں خوب روئی اور یہاں تک کہ دل ہلکا ہو گیا۔ اطمینان کا سانس لیا تو سوچا چلو میری پیدائش پر تو دادی خوش ہو گئی تھی۔ کوئی تو لمحہ ان کی زندگی میں حقیقی خوشی کا آیا۔ اٹھ کر نیچے گئی ٹھنڈا پانی پیا اور ادھر ادھر چکر لگا کر دوبارہ ڈائری پڑھنے کی ہمت کی۔ دادی نے لکھا ہے:

حمیرا تو صبح کالج پڑھانے چلی جاتی اور مومنہ میرے پاس ہوتی۔ سارا دن میرا مومنہ کے ساتھ پل بھر میں گزر جاتا۔ بہت ہی اچھی طبیعت کی بچی ہے۔ جیتی رہے اور اللہ اس کی قسمت اچھی کرے۔ شاید اسی لیے مجھ سے مینہ کے بچوں سے زیادہ پیار لیتی تھی۔ ویسے مینہ کئی دفعہ شکوہ کر چکی تھی مگر اس کی تو عادت ہی ایسی تھی۔ جتنا زیادہ مجھے مینہ سے پیار تھا اتنا ہی وہ مجھے دکھ دیتی

تھی۔ میری شادی پر اصغر نے صاف کہہ دیا تھا کہ سوائے ایک ہرے نگینے کی بریسلٹ کے باقی سارا زیور فیروز، مینہ اور منزہ کے لیے تھا۔ میں نے سنار سے قیمت لگوا کر تینوں کو دے دیا اور مینہ اور منزہ کو شادیوں پر اور فیروز کو جب میں اسے امریکا ملنے گئی تھی مگر مینہ کی یہی خواہش تھی کہ وہ بریسلٹ بھی میں اسے دے دوں مگر وہ بریسلٹ میں نے مومنہ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جب سے اصغر کا انتقال ہوا ہے فیروز اکثر فون کرتا رہتا ہے منزہ بھی سسرال والوں کی خدمت کر کے اپنا مقام بنا چکی ہے اور خوش ہے مگر مینہ نے ناک میں دم کیا ہوا ہے کہ جائیداد میں اسے حصہ چاہیے۔ بہت سمجھایا کہ اصغر نے اپنے ہاتھوں سے حصے کر کے شادیوں میں سب کو دے دیئے تھے۔ باقی جو ہے وہ میرے نام ہے جب مروں گی تو سب کو مل جائے گا۔ مگر اسے میری بات پر یقین نہیں آتا بلکہ ایک دن تو مجھ پر برس ہی پڑی کہ میں اسے جائیداد کے کاغذ دکھاؤں۔ مجھے جو دکھ ہوا اس کا اسے اندازہ ہی نہیں کہ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں جھوٹ کہہ رہی تھی۔ مینہ کو وہ وقت بھول گیا تھا جب دو مہینے میں اصغر سے ناراضگی مول لے کر اس کے امتحانوں کے دنوں میں اس کے کمرے میں سوئی تھی جب امتحان دینے جاتی تھی تو میں جائے نماز پر نفل اور جانے کیا کیا وظیفے پڑھا کرتی تھی اور اس نیکی کا صلہ اس نے یہ دیا کہ پڑھائی ادھوری چھوڑ دی۔ حالانکہ اس کو پتا تھا کہ اس وجہ سے میں بہت دکھی ہوئی تھی۔ شادی بھی میری مرضی کے خلاف کی۔ میٹھی عید پر کتنی بھی عیدی بھیج دوں ہمیشہ لمبے چوڑے

شکوؤں کا خط ہی آتا ہے وہ کچھ بھی مگر جب سامنے آتی ہے تو اس کی شکل میں شنو آپا کی جھلک مجھے پانی پانی کر دیتی ہے۔

مومنہ نے میٹرک کیا تو ایک نیا ہی شوشہ چھوڑا کہ منصور سے اس کی شادی کر دوں۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ ذرا سی معصوم لڑکی اور وہ پورا چھتیس سال کا مرد پیچھے ہی پڑ گئی تو میں نے کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے پڑھائی پوری کرنے دے۔ مگر مینہ کو چین کہاں۔ مومنہ نے ایف ایس سی کیا تو مٹھائی لے کر آ گئی شکر ہے حمیرا اور احسن کسی کی شادی میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مومنہ کے نمبر اچھے ہیں۔ ڈاکٹر بن جانے دے تو بولی:

''ہاں ڈاکٹر بن جائے تو ہمیں بھی فائدہ ہوگا اپنا ہسپتال کھول لیں گے۔''

اللہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے ہر وقت پیسہ بنانے کی سوچتی ہے۔ مومنہ نے اب میڈیکل میں داخلہ تو لے لیا ہے مگر کچھ ہی ماہ پہلے مینہ نے فون کیا اس کی پڑھائی چھڑوا کر شادی کر دیں۔ اگر پڑھائی زیادہ ضروری ہے تو کوٹہ میں کر لے گی۔ میں نے فون پر ہی سمجھانے کی کوشش کی تو بولی کہ ''میں نے ہمیشہ احسن کے معاملات کو باقی تین بہن بھائی پر ہمیشہ ترجیح دی اور ان تینوں کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں۔ جب میں نے پیار سے اسے سمجھایا کہ جس طرح مجھے اپنے ہاتھ کی سب انگلیاں عزیز ہیں اسی طرح سب بچے ہیں تو بولی:

''امی آپ جھوٹ نہ بولیں۔ ہمارے باپ نے، پیسے سے آپ

نے خوب عیش کیے اور اب بھی قبضہ کر کے بیٹھی ہیں۔''

مجھے تو لگا میرا سارا وجود لرز رہا تھا یا واقعی زلزلہ آیا ہوا تھا۔ وہ تو بعد میں پتا چلا کہ ہلکا سا سٹروک بھی ہوا تھا اور بلڈ پریشر بھی چڑھ گیا تھا شکر ہے مومنہ گھر پر ہی تھی بچت ہو گئی۔

ڈائری بند کر کے میں نے سوچا کاش واقعات کی تہہ دادی نے مجھے اپنی زندگی میں بتائی ہوتی تو میں اپنے سوالوں کے جواب ان سے ہی لے لیتی۔ خیر اگر گزرے ہوئے لمحات وقت کے آئینے میں ہر دم ہی منعکس رہیں تو کہنے سننے کو پھر رہ ہی کیا جائے۔ شاید تجسس ہی اس دنیاوی زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

❁❁❁

آٹھواں باب

دادی کی ڈائری پڑھنے اور امریکا کی سیر میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور مجھے تیسرا ہفتہ آ لگا۔

جمعے کی شام کو دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے لنکن سٹی پہنچے۔ یہاں چچا فیروز کا کیبن ہے جو کہ جھیل کے کنارے ہے۔ وہاں پہنچ کر لگا کہ کسی جنت میں پہنچ گئی۔ کیبن کے آس پاس چیڑ اور چنار کے درختوں کے علاوہ جنگل کو اور گھنا کرنے کے لیے بے شمار گھنی جھاڑیاں۔ علاقہ تو پہاڑی نہیں ہے لیکن شاید بہت شمال میں ہونے کی وجہ سے موسم خوشگوار تھا۔ یہاں پر زیادہ تر لوگ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ سردیوں میں تو اتنی برف پڑتی ہے کہ جھیل سخت برف کا میدان بن جاتی ہے۔ پوری آبادی کچھ ہزار لوگوں پر مشتمل ہے۔ پہنچتے ہی چچا اور چچی نے ادھر ادھر سے سامان نکال کر گھر درست کیا۔ لان میں کرسیاں رکھیں اور بالکل جھیل کے کنارے دو چیڑ کے درختوں کے ساتھ Hamock باندھ دیا۔ یہ ایک بہت مضبوط جالی کا جھولا ہوتا ہے جسے پاکستان میں گاؤں کی عورتیں چارپائی کے ساتھ دوپٹہ باندھ کر بچے کو لٹائے رکھتی ہیں کچھ اس طرح کا بڑوں کے لیے جھولا۔ چچی اور چچا جان اپنے کاموں میں لگ گئے۔ میں نے سوچا کیوں نہ جھولا آزمایا جائے اس میں خود کو بٹھانا یا لٹانا بہت ہی مشکل لگا۔ جس طرف سے بھی کوشش کرتی

دوسری طرف گر جاتی۔ شکر ہے آس پاس کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے جھولے کو اور جھولے نے مجھے قبول کیا اور میں نے اس میں لیٹ کر جھیل کی طرف منہ کیا اور آہستہ آہستہ جھولنے لگی۔ کیا جادو کیا اس جھولے نے اور اس جگہ کے ماحول نے سب کچھ بھلا کر اپنے اندر سمو لیا۔ سامنے چمکتی ہوئی جھیل دور دور نہ کوئی بندہ نہ بشر۔ جھیل کے اطراف میں کہیں کہیں درختوں میں سے جھانکتی گھروں کی کھڑکیاں۔ ہر گھر کے آگے کشتی کھڑی کرنے کے لیے جھیل میں جیٹی (Jetty) جو کہ پانی میں کافی دور تک لجائی گئی۔ دو طرح کی بطخیں جھیل میں بے نیازی سے پانی میں ایک جگہ سے ڈبکی لگاتیں اور کافی دور جا کر پانی سے باہر نکلتیں۔ کہیں کہیں پرندے چھوٹی مچھلیوں کی تلاش میں اڑتے ہوئے اور جوں ہی کسی پرندے کو پانی کے اندر مچھلی نظر آتی وہ ایک دم ڈائیو مار کر جھپٹ کر لے جاتا۔ ہلکی ہلکی پانی کی لہروں کی آواز بہت ہی سکون دے رہی تھی۔ ابھی میں اچھی طرح محظوظ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جھولے میں بھونچال آ گیا اور میں پانی میں گرتے گرتے بچی۔

''ارے بھئی یہ دن میں دیکھے ہوئے خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوا کرتی۔ خواب دیکھنے کے لیے کیا رات کافی نہیں ہے؟''

اچانک اپنے پیچھے سے مجھے آواز آئی اور میں نے بے دھڑک جو مڑ کر دیکھا تو یوں لگا کہ آنکھوں نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اتنا دھوکا کھایا

ہو گا۔ لگا گویا ابو اپنی جوانی میں مجسم میرے سامنے کھڑے تھے۔ ویسے ہی خدوخال، وہی وجاہت اور تمکنت، پروقار اور مقناطیسی شخصیت۔ شاید میں زیادہ ہی گھور رہی تھی کہ ایک اور فقرہ سنائی دیا۔ Sorry I didnt mean to scare you miss (معاف کرنا میرا مقصد آپ کو ڈرانا نہیں تھا) میں اپنے ہی خیالات میں گم سوچ رہی تھی کہ میں کہیں ٹائم میں پیچھے تو نہیں چلی گئی تھی۔ ٹی وی میں ایسے پروگرام تو دیکھے ہی تھے کہیں حقیقت میں تو ایسا نہیں ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے شروع ہو گئے اور زبان تو جیسے دانتوں کے شکنجے میں قید ہو کر رہ گئی۔ منہ سے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی۔

''ہیلو مجھے طلال کہتے ہیں اور میں قدرت کی طرف سے آپ کا چچازاد ہوں۔ دو چھٹیاں گزارنے وائیکونیہ سے آیا ہوں اور آپ غالباً احسن چچا کی اکلوتی بیٹی مومنہ ہیں۔ میرا خیال ہے میں نے صحیح نام لیا ہے۔ مشکل ہے مگر ڈیڈ کی وجہ سے یاد ہو گیا ہے۔ کئی ہفتوں سے ان کے منہ پر ہمارے ناموں کی بجائے بھی یہی نام آتا تھا ویسے ڈیڈ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ نے ابھی تک بولنا نہیں سیکھا!'' امریکن لہجے میں اردو بڑی عجیب پرمزے کی لگ رہی تھی۔ توبہ! اتنا باتونی بھی کوئی ہو گا میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن طلال کے آخری جملے نے میری زبان کو دانتوں کی قید سے آزاد کیا اور میں خیالوں کی دنیا سے نکل کر ہوش میں آئی اور بولی۔

''کیوں جناب میں کونسی اتنی اہم شخصیت ہوں کہ میرا نام آ جانے سے آپ فخر محسوس کر رہے ہیں۔''

اور بھی بہت کچھ کہنے کو جی چاہ رہا تھا مگر طلال نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے: (Enough Enough) بس بس کافی ہے۔

میرے ہونٹوں کے ساتھ میرے کان بھی سن ہونے شروع ہو گئے اور دل خواہ مخواہ تیز تیز دھڑکنے لگا شکر ہے کچھ اور ہونے سے پہلے ہی چچا فیروز کی آواز آئی۔

''بھئی طلال تمہاری شرارتوں سے یہ بھی محفوظ نہیں۔ ہٹاؤ اس کے منہ پر سے ہاتھ۔''

طلال کی اس بے باک حرکت پر میری آنکھوں میں نہ جانے آنسو کیوں آ گئے، کچھ حیرت بھی ہوئی لیکن ایک عجیب سی ہلچل پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ چچا نے قریب ہی پڑی ہوئی کرسیوں پر ہمیں بیٹھنے کو کہا اور دونوں کی درمیان والی کرسی پر خود بیٹھ گئے۔ جانے کیوں طلال سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولے۔

''بیٹا مومنہ اپنی نفیس شخصیت اور منجھی ہوئی عادات سے مجھے تو تمہاری دادی کی پرچھائیں لگتی ہے اور دادی کے ساتھ رہ کر ان کی بہت سی خوبیاں اس نے اپنا لی ہیں۔ نقش و نگار تو اللہ نے دیے ہی ان جیسے ہیں ایئرپورٹ پر اسے میں نے فوراً پہچان لیا تھا اور طلال بیٹا آپ کی اطلاع کے

لیے میٹرک سے اب تک اس نے ہر امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی ہے اور جو اول آتا ہے پاکستان میں اس کا انٹرویو اور تصویر ضرور آتی ہے کیوں بیٹی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی چچا!'' طلال بڑے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چچا بولے:

''ہاں! طلال تم اس سے اتنا ہی مذاق رکھو جتنا یہ برداشت کر سکے۔'' شاید شرارت کرنے کی اجازت پر طلال نے فاتحانہ چچا کو سلوٹ کیا اور "Yes Sir" کہہ کر لان میں ایک علیحدہ سے کمرے میں چلے گئے اور چچا فیروز بھی کیبن میں چلے گئے۔ میں کبھی طلال کے بارے میں سوچتی اور کبھی اردگرد کا جائزہ لینے میں محو ہو جاتی۔ سوچا جو علیحدہ کمرہ بنا تھا بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو بعد میں پتا چلا کہ کشتی رانی کا ہر طرح کا سامان اور کشتیاں اس میں رکھی جاتی ہیں۔ سب گھروں کے آگے علیحدہ علیحدہ کشتیاں کھڑی کرنے کے لیے شیڈ اور جیٹیاں پانی میں بنی ہوئی تھیں۔ چچا کے لان سے بھی ایک لمبا سا لکڑی کا بنا ہوا راستہ جھیل میں آگے تک جا تو رہا تھا لیکن کشتی کوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے سوچا ہوگی کوئی وجہ۔ ٹھک کیبن کا دروازہ بجا اور میں نے گھوم کر جو دیکھا تو ڈوب مرنے کے لیے جھیل بھی چھوٹی لگی۔ جی چاہا کوئی سمندر ہو تو اس میں غرق ہو جاؤں۔ چچا اور چچی اپنے سوم سوٹ پہنے تکلفاً تولیے گرد لپیٹے میری طرف آ رہے تھے۔ چچا نے تو

گھٹنوں تک نیکر پہنی ہوئی تھی لیکن چچی تو برائے نام ہی لباس میں تھیں۔ دادی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ اللہ کی ایک نافرمانی کرو تو نافرمانی کی سیڑھی خود بخود انسان کا ہاتھ پکڑ کر شیطان کے گھر تک لے جاتی ہے۔ میں کچھ حیران ہی کھڑی تھی کہ وہ دونوں مجھے بالکل نظر انداز کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے باغ کی بائیں طرف ہو لیے گویا کسی مشن پر جا رہے تھے میں رنج اور شرم کے ملے جلے جذبات میں غرق ان کے پیچھے ہو لی۔ گھنے درختوں کے پیچھے سے اچانک ایک لوہے کے فریم سے اٹکی ہوئی بڑی ساری موٹر بوٹ فریم کے پہیوں پر آہستہ آہستہ ڈھلوان پر بنی ہوئی سڑک سے پانی میں اترتی ہوئی دکھائی دی۔ چچا اس پر چڑھ گئے اور جب وہ پانی میں آدھی اتر چکی تو لوہے کے فریم سے بندھی ہوئی ایک بیجیر و نمودار ہوئی اور اسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کو چچا ہدایات دینے لگے۔ تھوڑا اور، تھوڑا اور، تھوڑا اور..... بس۔ میں چچا چچی کا حلیہ تو بھول بھال گئی اور یہ دیکھنے میں محو ہو گئی کہ ہو کیا رہا تھا۔ کشتی کا پورا نچلا حصہ پانی میں تھا اور اب غالباً اسے ٹرک سے علیحدہ کرنا تھا۔

ٹرک سے طلال برآمد ہوئے سفید ٹی شرٹ، سفید ٹوپی اور سرخ رنگ کی Shorts پہنے ہوئے۔ سرخ رنگ بھی کسی لڑکے پر اتنا بھلا نہیں لگا ہوگا لیکن میں کیا جانوں میں نے کون سے بہت سارے لڑکے بڑے غور سے دیکھے تھے۔ جب سے ہوش سنبھالی پڑھائی..... پڑھائی..... پڑھائی۔ امی

ابو کی خواہش یہی رہی کہ میں ہر کلاس میں اول آؤں اور شکر ہے ایسا ہی ہوا۔ سالہا سال یہی معمول رہا کہ صبح اٹھ کر پہلے اسکول بعد میں کالج گھر واپس آ کر ہوم ورک اور اگلے دن کی تیاری۔ رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی اٹھنا۔ ٹی وی بھی بہت کم دیکھنا۔ کبھی خاندان میں تقریب وغیرہ ہوتی تو میں دادی کے پاس گھر ہی رہتی کیونکہ امی کا خیال تھا کہ ادھر ادھر جانے سے پڑھائی پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ خیر ہو سکتا ہے سب لڑکوں کو سرخ رنگ اتنا ہی جچتا ہو گا۔ چچا نے بوٹ سٹارٹ کی اور جیٹی تک لے گئے۔ جب تک میں اور چچی لان کراس کر کے جیٹی تک پہنچے طلال بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً اپنا قیمتی مشورہ دے دیا کہ اگر مجھے بھی سوم سوٹ چاہیے تو کیبن میں فالتو پڑے ہیں۔ غصے اور شرم سے مجھے لگا میرا منہ سوج کر فٹ بال بن گیا ہو گا اور کانوں میں سے دھواں نکلنا لگا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ بولنا شروع کر دیا۔

''توبہ ہے! آپ سب کے تو لگتا ہے دیدوں کا پانی مر گیا ہے، شرم اور لحاظ یا مذہبی اقدار کی تو آپ لوگوں نے گٹھڑی بنا کر شاید ہمیشہ کے لیے اسی جھیل میں ڈبو دی ہے۔'' کہتی غصے میں کیبن کی طرف مڑی یہ ظاہر کرنے کے لیے مجھے کشتی میں نہیں جانا۔ طلال نے اپنا بازو آگے کر کے مجھے روکا اور بولے:

''ارے بھئی کیا فارسی میں غصہ جھاڑ رہی ہو آسان اردو یا انگلش میں کچھ کہو تو پلے بھی پڑے ویسے یہ بات طے ہے کہ تم ڈانٹ بھی سکتی ہو اور

غصے میں بہت خوفناک بھی لگتی ہو۔''

(I dont care how I look)''مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں کیسی لگتی ہوں۔ جیسا اللہ نے بنا دیا بس ویسی ہی ہوں۔'' میرا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''اچھا اب غصہ جانے دو اور کم از کم یہ لائف جیکٹ پہن لو۔''

طلال نے میری طرف جھٹ سے جیکٹ پھینکی اور خود کشتی میں کود پڑے۔ میں بھی جیکٹ کی ڈوریاں کستی ہوئی بوٹ میں اتر گئی۔ چچا نے جھیل کی طرف سٹیرنگ گھمایا اور آن کی آن میں پانی کو چیرتے ہوئے ہم کیبن سے بہت دور نکل گئے۔ آگے چچا اور چچی بیٹھے تھے اور پچھلی دو کرسیوں پر میں اور طلال بیٹھ گئے۔ نہ جانے مجھے پانی سے ڈر کیوں نہیں لگ رہا تھا شاید اس لیے کہ میں نے لائف جیکٹ پہنی ہوئی تھی یا پھر اردگرد کے ماحول میں میں گم تھی۔ ابھی یہ گتھی میں سلجھا ہی رہی تھی کہ بوٹ کے انجن بند ہوئے اور طلال نے ایک تختہ سا اٹھایا اور پانی میں لنگر ڈالنے کے لیے اپنے مضبوط ہاتھوں سے کوئی وزنی چیز نکالی اور اسے جھیل میں ڈال دیا۔ مکمل خاموشی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ صرف کشتی سے پانی کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی اور دور دور تک آبادی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔ طلال نے لنگر ڈالتے ہی ٹوپی اور ٹی شرٹ اتاری اور جھیل میں چھلانگ لگائی اور نہ جانے کس طرف نکل گئے۔ چچا بولے۔

''مومنہ ہم تو پانی میں یہاں کافی وقت رہتے ہیں۔ کبھی کوئی دوست وغیرہ مل جائے تو زیادہ ہی وقت لگ جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتی ہو تو چلو اگر تمہیں تیرنا نہیں بھی آتا تو یہ جیکٹ تمہیں ڈوبنے نہیں دے گی۔ اگر تم کشتی میں رہنا چاہو تو تم اکیلی بھی محفوظ ہو۔'' میں نے کشتی میں ہی رہنے کو ترجیح دی اور وہ دونوں بھی چلے گئے۔ جب تک وہ دونوں مجھے نظر آتے رہے تب تک تو خیر رہی لیکن جب وہ مجھ سے بہت دور ہو گئے تو مجھے یوں لگا کہ یا تو کشتی نے ڈولنا شروع کر دیا یا پھر میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں نے دل پکا رکھا اور جب مسئلے کی تہہ تک پہنچی تو پتا چلا کہ بہت دور جب موٹر بوٹس تیزی سے گزرتی تھیں تو پانی کی ہلچل کا اثر مجھ تک بھی پہنچ جاتا تھا اور واقعی کشتی ہلنے لگتی تھی۔ سمجھ تو میں گئی تھی مگر اب کنجِ تنہائی۔ یہ بوٹ تھی اور میں تھی۔

پاؤں ساتھ والی کرسی پر رکھے اور گھٹنوں کو دونوں بازوؤں کے حلقے میں مضبوطی سے پکڑ کر آنکھیں بند کیں اور سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔ بند آنکھوں میں میرے دماغ میں لہریں بنتی رہیں اور جانے کیوں میری پیاری دادی کی ڈائری کا ایک ایک صفحہ ان لہروں کی طرح کھلتا اور بند ہوتا گیا۔ خدا جانے کتنا وقت گزر گیا اور شاید اسی حالت میں مجھے اونگھ آ گئی اور ایسا لگا کہ میں کشتی میں دادی کے ساتھ بیٹھی ہوں اور چاروں طرف اشارے کر کے کہہ رہی ہوں کہ '' دادی دیکھیں نا یہ جگہ کتنی اچھی ہے اور چچا چچی اور طلال بھی

کتنے اچھے ہیں۔'' وہ کچھ جواب نہیں دے رہیں صرف مسکرائے جا رہی ہیں آخر میں انہیں لپٹ کر جھنجھوڑ کر کہہ رہی ہوں۔ ''دادی کچھ بولیں بھی تو سہی۔'' اور جب زیادہ جھنجھوڑا تو آنکھ کھل گئی اور لگا کشتی میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ شکر ہے میں پانی میں نہیں گر گئی۔ ایک دم گھبرا کر ڈولتی ڈولتی کھڑی ہو گئی دیکھا تو یہ زلزلہ طلال کی آمد سے آیا تھا۔ تیز دھوپ کی کرنیں طلال کے سر سے پاؤں تک پانی کی بوندوں کو آب و تاب دے کر ان کی وجاہت اور شخصیت کو اور زیادہ نکھار رہی تھیں۔ میں تو ویسے ہی ہچکولوں سے ڈانواڈول ہو رہی تھی۔

❁❁❁

نواں باب

کشتی ذرا ہلنا کم ہوئی تو طلال نے ایک شیلف میں سے تولیہ نکال کر جسم پر لپیٹ لیا اور بولے:

''بھئی تمہیں بھوک نہیں لگتی۔ کوئی پک نک باسکٹ وغیرہ نظر نہیں آ رہی۔''

میں نے سوچا واقعی اگر اس وقت گرم گرم کافی اور شامی کباب یا چائے اور سموسے ہوں تو خوب مزا آئے مگر اس جگہ یہ سوچ پوری ہوتی لگتی نہ تھی۔ اگلے ہی لمحے بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور میں بوکھلا گئی اور بولی:

''ارے طلال یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چچا اور چچی کے بغیر کہاں جا رہے ہیں۔ وہ ہیں کہاں، اور ہم چلے گئے تو وہ کیا کریں گے۔''

طلال نے ایک نہ سنی اور کچھ ہی دیر میں ایک ریستوران کے سامنے پہنچ کر باقی کشتیوں کے ساتھ بوٹ کھڑی کر دی۔

مینیاپلس کے لوگوں کو پانی اور پانی سے متعلقہ تفریح سے بہت لگاؤ ہے کیونکہ یہاں تقریباً دس ہزار قدرتی جھیلیں ہیں اور اگر موسم صاف ہو تو ہر جھیل پر خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ جہاں طلال نے بوٹ کھڑی کی سامنے ریستوران میں خوب رونق تھی۔ طلال بولے:

''محترمہ اتروگی بھی یا بوٹ سے گوند لگا کر چپکی بیٹھی ہو اس ڈر سے

کہ گر نہ جاؤ۔''

''ہاں! ہاں!'' کہتے ہوئے میں ایک دم کھڑی ہو گئی اور سامنے جیٹی پر کھڑے طلال کی مدد سے بچنے کے لیے جلدی اور گھبراہٹ میں جو بوٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو پاؤں بجائے جیٹی پر پڑنے کے سیدھا پانی تک ہی جا پایا اور اس کے بعد سوائے اپنی چیخوں کے مجھے کچھ یاد نہیں۔ طلال نے فوراً چھلانگ لگائی اور بڑے اطمینان اور مہارت سے بغیر کچھ بولے مجھے باہر نکالا۔ چیخیں تو میری بند ہو چکی تھیں لیکن ندامت کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہی چلے جا رہے تھے اور میں رک رک کر گھگھیائی آواز میں "Sorry, Sorry" کہے جا رہی تھی۔ امریکا میں ایک اچھی بات ہے کہ کچھ بھی ہو جائے تماشا دیکھنے کے لیے لوگ اکٹھے نہیں ہوتے۔ جھیل کے ریستوران میں جو لوگ ساحل پر کرسیوں پر بیٹھے تھے ان کی شکلوں سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوش تھے کہ خیریت سے باہر آ گئی تھی۔ ورنہ وہ اپنی گپوں اور کھانوں میں مصروف تھے۔ طلال نے بڑی بے تکلفی سے میری کمر کے گرد اپنے بازو کا سہارا دیا جو اس وقت مجھے کھڑا رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ لہٰذا میں بھی خاموش رہی۔ طلال بہت ہی نرمی اور پیار سے بولے:

''اب تم کیا کرنا چاہتی ہو، تم روتی رہو اور میں تھامے رہوں، یا بوٹ میں واپس چلیں یا کچھ کھا پی لیں۔''

میرا دل تو رونے کو ہی چاہ رہا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ طلال سے پہلے ہی بہت زیادتی ہو چکی تھی۔ واپس چلے گئے تو بے چارے بھوکے رہ جائیں گے۔ لہٰذا بہت کوشش کر کے توقف کے بعد میں نے طلال کا ہاتھ کمر سے ہٹایا اور بڑے پر اعتماد لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کھانا کھانے آئے ہیں کھا کر ہی جائیں گے۔''

''That's my girl یہ ہوئی نا بات! شاید بے اختیار طلال کے منہ سے نکل گیا۔ میں نے جیسے سنا ہی نہیں اور خالی میزوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتی طلال کا خیال کیے بغیر جو بھی پہلا خالی میز نظر آیا کرسی پر بیٹھ گئی۔ دراصل ایک تو مجھے سردی لگ رہی تھی کیونکہ میرے سب کپڑے گیلے تھے دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے جارجیٹ کا سوٹ سوکھ جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ طلال بھی آ کر بیٹھ گئے اور میں نے کہا۔

''طلال چچا اور چچی کہاں ہیں اور ہم کیبن میں کب جائیں گے اور ہم اکیلے یہاں کیوں آئے ہیں۔''

طلال نے جیسے سنا ہی نہیں کہ میں نے کیا کہا اور خود ہی سوال کر ڈالا۔

''مس ..... مو ..... میہ ..... نہ (ذرا ٹھہر ٹھہر کر میرا نام لیا) پہلے آپ اس سوال کا جواب دیں کہ آپ نے کھانا کیا ہے؟ نام سے تو ظاہر ہوتا

ہے کہ یہاں آپ کو حرام اور حلال کی بہت فکر ہو گی لیکن کئی دفعہ نام دھوکا بھی دے دیتے ہیں۔ خیر آپ کی اطلاع کے لیے یہاں کے مینو میں سوائے مچھلی کے سب چیزوں کو آپ حرام ہی سمجھیں۔''

''جو آپ کھائیں گے وہی میرے لیے منگوالیں۔''

''بھئی میرا کیا ہے میں تو آزاد ملک کا آزاد باشندہ ہوں۔ خیر چلو ایسا ہی سہی لیکن بعد میں کچھ نہ کہنا۔''

اور ویٹرس کو انہوں نے Captians Catch کا آرڈر دے دیا۔ میں نے سوچا ماری گئی۔ اللہ جانے اس میں کیا ہو گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ خاموش بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ اگر دادی زندہ ہوتیں تو اول وہ مجھے امریکا آنے ہی نہ دیتیں اور نہ میں آتی نہ ان مشکلات میں پڑتی اور اگر مجھے آنا ہی تھا تو وہ میرے ساتھ آتیں مگر امی اور ابو کو کیا کہوں۔ ان کے تو خیالات ہی اور ہیں۔ امی کی باتوں پر ابو اکثر خاموش ہو جاتے ہیں اور امی کی تو ایک ہی رٹ ہے کہ لڑکیوں کو خود مختار ہونا چاہیے۔ اگر امی کو ایسی ہی بیٹی چاہیے تھی تو زیادہ وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتیں جبکہ خود تو انہوں نے خود مختار زندگی گزاری اور مجھے دادی کی شفیق اور گداز گود کی ٹھنڈی چھاؤں میں چھوڑے رکھا۔ امریکا بھیجنے کا بھی ان کو ہی شوق تھا ابو نے ایک دو دفعہ ہلکے سے کہا بھی کہ ''کراچی تک تو اکیلی گئی نہیں امریکا کیسے جائے گی۔ مگر امی کا آخری فیصلہ تھا کہ لڑکی آدھی ڈاکٹر بن گئی ہے اور ذرا بھی زمانے کی ہوا

نہیں لگی۔ زندگی کیسے گزارے گی۔''

اس وقت تو مجھے گیلے کپڑوں میں امریکا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کپکپاہٹ دلا رہی تھی اور سامنے ڈاکٹر طلال کی شوخ نظریں مجھے کھائے جا رہی تھیں اور میں ڈر رہی تھی کہ میری کپکپی طلال پر نہ کہیں ظاہر ہو جائے۔ شکر ہے ویٹرس نے کھانا لا کر چنا لیکن پلیٹ پر جو میری نظر پڑی تو قسم قسم کی چیزیں نظر آئیں میں گھبرا گئی مگر ہمت کر کے طلال سے پوچھ ہی لیا۔

''طلال یہ تو عجیب سی چیزیں لگ رہی ہیں یہ کیا کچھ ہے؟''

شکر ہے انہوں نے مذاق کئے بغیر ہی بتایا کہ وہ سارا Sea Food تھا۔ مچھلی، جھینگے، کیکڑے اور سکوئب ایک طرف پلیٹ میں ڈھیر سارے فرنچ فرائیز اور سلاد۔ چار بندوں کا کھانا لگ رہا تھا کھاتے کھاتے میں نے ہمت کی اور طلال سے پوچھا۔

''طلال! آپ نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔'' وہ بولے۔

''بھئی کون سے سوال؟ سنا تو یہی ہے کہ لڑکا کسی لڑکی سے اور لڑکی لڑکے سے ایک ہی سوال کرتے ہیں یہ تمہارے کتنے سوال ہیں؟''

شاید کھانا طلال کے پیٹ میں گیا اور انہیں شوخی سوجھی۔ میں نے کہا۔

''طلال چچا اور چچی جان کہاں ہیں اور ہم یہاں اکیلے کیوں آئے

ہیں اور کیبن کب جائیں گے۔'' طلال بولے:

''جو اصلی سوال ہے وہ تو تم نے پوچھا نہیں۔ چلو خیر تمہارے سوالوں کے جواب یہ ہیں کہ امی ابو اس وقت نہ جانے کہاں ہوں گے اور ہم یہاں اکیلے نہیں آئے ہم دونوں آئے ہیں اور جب چاہے گا کیبن میں چلے جائیں گے۔''

طلال بے نیازی کی مکمل تصویر بنے ہوئے تھے۔ میں نے پلیٹ ایک طرف کھسکاتے ہوئے ذرا رعب سے کہنے کی کوشش کی۔

''یہ بات ہے تو میں کوئی کھانا وانا نہیں کھا رہی۔''

''اچھا بھئی سنو امی ابو کو اپنے کوئی دوست مل گئے تھے وہ ان کے ساتھ کیبن جا چکے ہوں گے۔ مجھے انہوں نے کہا کہ میں تمہیں کیبن لے جاؤں۔ بس اب خوش ہو۔''

طلال نے جب یہ صورتِ حال بتائی تو میرے تو چھکے چھوٹ گئے اور میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور کافی اونچی آواز میں میرے منہ سے نکلا۔

''طل..... لال! یہ آپ نے کیا کیا؟''

''ارے ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ ایک دفعہ تو میں نے جھیل سے نکال لیا۔ اب اپنی ذمہ داری پر چھلانگ لگانا میری طرف سے خدا حافظ۔'' اور طلال کھانے میں مصروف ہو گئے اور کھانا پینا بھول کر مجھے تو فکر لگ گئی کہ چچا کیا سوچتے ہوں گے۔ شاید میری گھبراہٹ طلال نے محسوس کر

لی اور بولے۔

''مومنہ بیٹھ جاؤ۔ ایسا بھی اندھیر نہیں۔ میں بحفاظت تمہیں کیبن تک پہنچادوں گا۔'' اطمینان سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے جارہے تھے اور اتنی بڑی پلیٹ آدھی کر دی تھی۔ میں بھی بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگ گئی۔ طلال بولے۔

''مومنہ تم نے یہ نہیں بتایا کہ امی ابو نے تمہیں مال آف امریکا دکھایا کہ نہیں۔''

''طلال گولی ماریں مال آف امریکا کو۔ کیبن واپس چلیں۔''

''لو بھئی کمال کرتی ہو ایک ہی چھت کے اندر دنیا کا سب سے بڑا مال ہے اور تم کہتی ہو کہ ایک گولی سے اڑادوں۔''

''میں نے اڑانے کو کب کہا ہے میرا مطلب ہے کہ اس کا ذکر نہ کریں ویسے میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اس وقت تو کیبن جانے کی فکر کھا رہی ہے۔ خدا کے لیے جلدی ختم کریں اور واپس جلدی چلیں۔'' اپنی طرف سے میں نے بڑی اچھی طرح طلال کو مائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو کسی اور ہی موڈ میں تھے بولے۔

''سنا ہے تم دادی کے پاس بہت وقت گزارا کرتی تھیں اور تمہیں ان سے بہت پیار ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''جی ہاں! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''اعتراض تو بالکل نہیں بلکہ شکر ہے کہ میں ان کے ساتھ نہیں رہا ورنہ تمہارے جیسا ہی ڈرپوک اور مخبوط الحواس انسان ہوتا۔''

کاش مجھ میں ہمت ہوتی اور میں کشتی چلا کر کیبن چلی جاتی مگر اس وقت تو مجبوراً طلال کی کڑوی کسیلی باتیں سننا میری مجبوری تھی۔ لہٰذا بغیر کوئی جواب دیے دوسری طرف منہ کر کے اپنا غصہ آنسوؤں میں بہانے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر نہ جانے کیوں طلال کی طرف سے بھی کافی خاموشی رہی آخر جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو منہ سیدھا کر کے میں نے آرام سے طلال کو مخاطب کیا۔

''طلال پلیز اب چلیں۔'' طلال نے زور دار قہقہہ لگایا اور بولے:

''توبہ توبہ! اب تو اس وقت بالکل نہیں جاسکتے تمہاری لال چقندر آنکھیں دیکھ کر امی ابو سمجھیں گے میں نے تمہیں بہت ستایا ہے۔''

''تو کیا مجھے کوئی فرشتہ ستا رہا ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''بہت بہت شکریہ فرشتہ سمجھنے کا۔ سنا ہے گرمی کو گرمی کاٹتی ہے۔ میرا خیال ہے گرم گرم کافی پیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر طلال نے دو کافی کا آرڈر دے دیا اور خود جھیل کے کنارے جنگلے سے ٹیک لگا کر پانی میں بطخوں کو دیکھنے میں محو ہو گئے ویٹرس کافی لے آئی اور وہ بے نیازی سے وہیں کھڑے رہے۔ گرم کافی کے

دھوئیں سے مجھے الہ دین کا چراغ دماغ میں آ گیا۔ کاش اس دھوئیں میں سے دادی نکل آتیں تو ان سے پوچھتی کہ ان کے اس پوتے کو کیا کروں۔ اس نے مجھے کس الجھن میں ڈال دیا لیکن کہانیاں تو کہانیاں ہوتی ہیں۔ مجبوری کے تحت شاید میں نے بہت پیار سے طلال کو آواز دی۔

''طلال کافی آ گئی ہے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' آؤ دیکھا نہ تاؤ طلال جھٹ سے پلٹے اور کرسی میرے قریب کر کے بولے۔

''کیا مجھے آواز تم نے دی تھی؟''

''نہیں تو اور کس نے۔''

''بڑی سریلی آواز تھی میں سمجھا میرے کان بج رہے ہیں۔''

''ہوں! بڑے خوبصورت کان ہیں نا کہ جب بجتے ہیں تو بے سری آوازیں بھی سریلی سنائی دیتی ہیں۔''

''شکر ہے ایک سچائی کا تو تم نے اعتراف کیا۔'' طلال نے کافی ختم کی اور کھڑے ہو کر بولے۔ ''چلو اسی خوشی میں کیبن واپس چلتے ہیں۔''

اب تو طلال کا ہاتھ پکڑ کر ہی بوٹ میں بیٹھنا پڑا۔ انجن اسٹارٹ ہوا تو جان میں جان آئی۔ فضا میں خنکی کی وجہ سے طلال نے بوٹ کا ہڈ کھول دیا اور ماحول بڑا خوشگوار سا لگنے لگا۔ طلال مہارت سے سٹیرنگ کنٹرول کر رہے تھے اور کشتی تیزی سے پانی کو کاٹتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی میری دن بھر کی گھبراہٹ دور ہوتی جا رہی تھی۔ اتنے میں طلال نے انگلی سے دور اشارہ

کیا اور بولے۔ ''مومنہ وہ دیکھو کیبن نظر آ رہا ہے۔'' مجھے بھلا کب پتا چلنا تھا۔ مجھے تو امریکا میں سب گھر ایک جیسے ہی لگتے تھے۔ طلال نے ایک ڈبے سے دوربین نکالی اور مجھے اپنے بہت قریب کر کے کیبن دکھانے کی کوشش کی جیسے ہی مجھے کیبن نظر آیا میں بچوں کی طرح جوش میں بولی۔

''ارے واہ! طلال وہ دیکھو کیبن کے باہر چچا اور چچی آگ جلا کر بیٹھے ہیں ہائے طلال انہیں کتنا مزا آ رہا ہو گا۔'' دبی سی آواز میں طلال بولے۔ ''ہم سے زیادہ نہیں۔''

مجھے لگا میرے دل کی ہر دھڑکن طلال کی بات کی تائید کرنی شروع ہو گئی اور میں نے طلال سے ہٹ کر دوربین چاروں طرف گھما گھما کر نظارے دیکھنا شروع کر دیے۔ غالباً میں ہی سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ملبوس تھی۔ ورنہ تو ہر طرف نیم برہنہ عورتیں اور مرد پانی میں نہاتے واٹر سکیٹنگ کرتے۔ واٹر سکوٹر چلاتے۔ ٹیوبنگ کرتے اور مچھلیاں پکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑی خوشحال قوم ہے اور خوشحالی کا راز یہ ہے کہ سارا ہفتہ خوب محنت سے کام کرتے ہیں اور چھٹی والے دن خوب جی بھر کر تفریح کرتے ہیں۔ کیبن سے کچھ فاصلے پر طلال نے انجن بند کیا اور کشتی آرام سے جیٹی کے ساتھ لگا کر مجھے اترنے کو کہا۔ اس دفعہ میں بغیر طلال کی مدد کے باہر نکل آئی اور فاتحانہ انداز میں چچا اور چچی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہاں شام ہوتے ہی گھروں میں Bar B Q کرنے کا بہت رواج ہے

کسی کے پاس لان نہ بھی ہو تو بالکنیوں میں کر لیتے ہیں۔ اس وقت بھی آس پاس کے گھروں سے کوئلوں کی خوشبو آنی شروع ہو گئی تھی اور چچا بھی گرل میں گیس پر کوئلے دہکا رہے تھے۔ میز پر سلاد اور ڈرنکس اور چپس رکھے تھے۔ اپنا حال سنانے سے پہلے میں نے چچا چچی کا حال پوچھا ہی تھا کہ طلال فرش اپ ہو کر آ گئے۔ نیلی جینز اور سفید ٹی شرٹ میں بہت ریلیکسڈ لگ رہے تھے۔ آتے ہی مزے لے لے کر جو انہوں نے دن بھر کی کارروائی سنانی شروع کی تو میں اٹھ کر اندر چلی گئی۔ خوب گرم پانی سے شاور لیا اور گرم گرم چائے بنا کر اندر بیٹھ کر ہی جھیل کے مزے لینے لگی۔ کیبن میں کھانے کی میز پر بیٹھ کر یوں لگتا ہے جیسے سمندری جہاز میں بیٹھے ہوں کیونکہ کھڑکیاں کے باہر جو زمین ہے وہ ڈھلوان ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ نگاہ سیدھی جھیل پر پڑتی ہے۔ اس سے حسین بھلا جنت کیا ہو گی۔ چائے پیتے ہوئے مجھے پہلی دفعہ خیال آیا کہ چچا کی بیٹی شہلا نے ابھی تک کوئی گھر سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی ان لوگوں نے اپنی روزمرہ کی بات چیت میں اس کا ذکر کیا۔ اچانک خیال گزرا کہ آخر طلال نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اپنے مہمل خیالات کو ادھر ادھر کرنے کے لیے میں نے ٹی وی چلا دیا۔ صرف تصویریں دیکھنے کے لیے ٹی وی کی آواز بند رکھی کیونکہ اتنا پرسکون ماحول میں خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلی نظر جو ٹی وی پر پڑی تو یوں لگا کہ دو عدد مرد خوب سجے بنے، کالر پر پھول لگائے ایک پادری کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک مرد

دوسرے کو انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے میں نے ٹی وی کی آواز اونچی کی تو پتا چلا کہ واقعی ان دونوں مردوں کی شادی ہو رہی تھی۔ سامنے میز پر بائبل پڑی ہوئی تھی۔ خدا کی پناہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے ابھی تک جس پیالی سے میں خود کو فردوسِ بریں میں محسوس کر رہی تھی یوں لگنے لگا کہ دوزخ میں بیٹھی خون اور پیپ حلق میں اتار رہی تھی۔ توبہ توبہ کی اور ٹی وی بند کر دیا۔ دادی کی کہی ہوئی بڑی پرانی بات یاد آ گئی وہ سناتی تھیں کہ قرآن میں ایک قوم کا ذکر ہے جو یہ کام کرتے تھے اور سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر پتھروں کی بارش کر کے ہلاک کر دیا پوری بستی تہس نہس ہو گئی اور اس کے کھنڈرات کے اوپر سمندر کا پانی چھا گیا اور ساتھ ہی وہ خبر یاد آئی کہ انیسویں صدی میں ناسا نے سٹیلائٹ کے ذریعے سے یہ بستی بحرِ مردار کے نیچے دریافت کی ہے۔ سوچا کہ ایسی ایسی عبرتناک نشانیاں دیکھ کر بھی یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں ایک طرف تو بہت ہی اچھے کام کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ بے راہ روی۔ میری طبیعت بہت ہی بوجھل ہونے لگی اور ایک خوف سا طاری ہونے لگا کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس قوم کا بھی وہی حشر نہ کرے جو اس قوم کا کیا۔ یہ فلک بوس عمارتیں اللہ کو ڈھیر کرتے کون سی دیر لگتی ہے۔ سوچا کل ہی پاکستان کے لیے سیٹ بک کراؤں اور اس عجیب ملک سے بھاگوں۔ یہ سب سوچ سوچ کر شاید میرے چہرے کا رنگ بدل گیا ہو گا کہ طلال نے اندر آتے ہی کچھ کہنے سے پہلے میری نبض پکڑی اور بولے۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''کچھ نہیں ہوا شاید تھک گئی ہوں۔''

''تھکاوٹ سے چہرہ اتر ضرور جاتا ہے مگر لٹھے کی طرح سفید نہیں ہوتا۔ سچ بولو کیا بات ہے۔ ویسے میں تمہیں بتانے آیا تھا کہ Bar B Q تیار ہے۔'' بھلا مجھ میں کہاں ہمت تھی کہ طلال کو میں سچ بتاتی۔ خیر میرا جواب سنے بغیر وہ جلدی سے گرم دودھ میں چاکلیٹ ڈال کر لے آئے اور مجھے پینا پڑا جب دودھ ختم ہوا تو آرام سے بولے۔

''اب بتاؤ تمہیں کیا ہوا تھا؟ میں تمہیں باہر نہیں جانے دوں گا اور دیکھنا تھوڑی دیر بعد مام اور ڈیڈ اندر آ جائیں گے پتا کرنے کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔''

مسئلہ گھمبیر دیکھ کر میں نے شاید زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا۔

''مجھے امی ابو یاد آ رہے ہیں۔''

''ہاہاہا! امی ابو کی یاد؟ ان کو تو چھوٹے بچے یاد کرتے ہیں ایک عدد ڈاکٹر کو یہ زیبا نہیں دیتا۔ ہماری شہلا کو دیکھو ساری زندگی کے لیے امی ابو کو چھوڑ کر چلی گئی۔''

''ہیں فوت ہو گئیں؟ کب فوت ہوئیں؟''

''کیا مطلب تمہیں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم؟''

مجھے تو پیروں تلے سے زمین کھسکتی لگی۔ لیکن شاید بر وقت چچا

بولتے بولتے اندر آئے۔

''بھئی دیر کیوں ہو رہی ہے اتنی محنت اور شوق سے تمہارے لیے تکے اور کباب بنائے ہیں۔ بس اب باہر آ جاؤ گرل پر زیادہ رہے تو مزا خراب ہو جائے گا۔'' شہلا کی بات وہیں رہ گئی اور میں نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ اتنے خوشگوار ماحول میں شہلا کا ذکر چھیڑ کر ان کے دل دکھاؤں۔

دسواں باب

اچھا سا موڈ بنا کر میں سیدھی چچی جان کے پاس چلی گئی اور گرل میں سے کباب نکال کر ڈش میں رکھ کر میز پر رکھ دیئے۔ چچا نے بیٹھتے ہی طلال سے کہا کہ وہ آگ میں اور لکڑیاں ڈال کر پھر کھانا شروع کریں۔ موٹے موٹے لکڑی کے ٹکڑے بڑی ساری گول انگیٹھی میں جلا کر یہ بون فائر کرتے ہیں۔ پرانے زمانے کی طرح آگ تاپتے ہیں۔ ویسے آج کل اتنی لکڑی جلانا عیاشی ہے۔ کباب گیس کی گرل پر بن رہے تھے۔ طلال آگ بھڑکاتے جاتے تھے اور اس کی تیز ہوتی روشنی میں چنگاریاں ان کے چاروں طرف پٹاخے چھوڑتی بکھرتی جاتی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے جلتے بجھتے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند چمک رہا ہو۔ طلال پر سے نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔ میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو میں ادھر ادھر کرنے لگ گئی۔ مگر کن اکھیوں سے طلال کو بھی دیکھتی جاتی۔ جھیل کا پانی اس وقت بالکل ساکت تھا اور دور گھروں کی بتیوں کے عکس اس میں نظر آ رہے تھے۔ مکمل خاموشی میں چنگاریوں کا رقص اور ہلکی ہلکی لہروں کی آواز اور سامنے کھڑے طلال۔ ساری عمر اس منظر کی دلکشی شاید میرے جذبات پر حاوی رہے گی۔ چچا کی آواز نے میری سوچ کا طلسم توڑا۔

''مومنہ آج پھر تمہیں خوب مزہ آیا۔ طلال کہہ رہا تھا کہ تم دونوں

نے خوب Enjoy کیا۔''

شکر ہے میں کھانا ختم کر چکی تھی ورنہ نوالہ میرے حلق میں ہی اٹک جاتا۔ طلال بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے گھبراہٹ میں بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

''جی چچا جان۔'' اور میں نے طلال کی طرف دیکھا تو بڑی فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر لیے کباب کھا رہے تھے میں نے سوچا اللہ جانے چچا اور چچی کو طلال نے کتنی گپیں سنائی ہوں گی مگر قصور میرا ہی تھا میں انہیں چھوڑ کر اندر کیوں چلی گئی تھی۔ چچا جان مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''مومنہ ہمارا یہ بیٹا تو بس پڑھاکو ہے۔ ہاں! کچھ اسپورٹس میں حصہ لے لیتا ہے۔ باقی اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ ٹیں تو اسے مولوی کہتا ہوں۔''

میں نے سوچا مولوی سے پتا نہیں چچا کا کیا مطلب تھا لہٰذا میں خاموش رہی اور حیرت ہے طلال بھی کچھ نہ بولے۔ کچھ دیر وہ لوگ اگلے دن کا پروگرام بناتے رہے مگر میرا ذہن شہلا پر ہی اٹکا ہوا تھا کہ اس کا کیا بنا۔ مجھے خاموش دیکھ کر چچی بولیں۔

''مومنہ کیا بات ہے۔ بہت خاموش ہو۔ کیا تھک گئی ہو؟''

''بس یونہی چچی شاید پہلی دفعہ گھر سے اتنی دور ہوں۔''

طلال بولے: ''ہاں بھئی بچوں کو امی ابو تو یاد آتے ہی ہیں۔''

چچا جان نے اتنی دیر میں گرل بند کر کے پیپر پلیٹس (Paper

(Plates وغیرہ جمع کر کے ٹریش بیگ میں ڈال لیے تھے۔ بولے:

''طلال کیوں مومنہ کو تنگ کرتے ہو۔ یہ اعتراف تم نے آج کر لیا ہے کہ مومنہ جیسی لڑکی تم نے پہلی دفعہ دیکھی ہے اور.....''

''ہاں! ڈیڈ یہ بات تو سچ ہے مگر.....''

''مگر وگر کچھ نہیں۔ ایسا کچھ نہ اسے کہنا کہ ہمارے ساتھ گزرا ہوا وقت اسے ساری زندگی haunt کرتا رہے اور میں تو اب سونے چلا صبح مچھلیاں پکڑنے جانا ہے آپ لوگوں میں سے بھی کسی نے جانا ہو تو سورج نکلنے سے پہلے اٹھ جانا۔''

یہ کہہ کر چچا تو اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد چچی بھی چلی گئیں۔ لیکن میری نیند تو شہلا کے تصور میں اڑی ہوئی تھی۔ طلال نے آگ بجھانی شروع کر دی اور بولے:

''میرا خیال ہے میں بھی صبح ڈیڈ کو کمپنی دوں۔ مچھلیاں تو مشکل سے ہی پکڑی جاتی ہیں۔ اچھا مومنہ شب بخیر صبح ملاقات ہوگی خدا حافظ۔''

''طلال آپ نے مجھے شہلا کا نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئی۔'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''بھئی وہ جہنم میں گئی۔'' طلال بہت عجیب لہجے میں بولے۔

''مذاق نہ کریں طلال! کسی بھی مرنے والے کے لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جنت میں گیا یا جہنم میں گیا۔ شہلا تو پھر آپ کی بہن تھی۔'' میں نے

بڑے دکھ سے کہا مگر طلال نے ایک موٹی سی لکڑی بجھاتے ہوئے کہا۔

''مس مومنہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ جیتے جی جہنم میں چلی گئی۔''

پریشانی اور گھبراہٹ میں میں نے طلال کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور کرسی کی طرف کھینچا۔ شکر ہے وہ گرے نہیں اور بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔

''طلال خدا کے لیے مجھے بتائیں کہ ماجرا کیا ہے۔'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''سننا چاہتی ہو تو سنو، ہم تین بہن بھائی ہیں ایک بہن اور دو بھائی۔''

''دوسرا بھائی کہاں ہے۔'' میرے منہ سے اچانک نکلا۔ طلال بولے۔

''تم شہلا کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہو کہ بھائی کے بارے میں۔ پہلے یہ فیصلہ کرو۔'' میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی اور طلال بات کو طول دے رہے تھے۔

''طلال آپ کو تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ خیر چلیں شہلا کا بتائیں۔ آخر اسے ہوا کیا؟'' شکر ہے طلال سنجیدہ ہوئے اور بولے:

''تمہیں امریکا میں آئے صرف چند ہفتے ہوئے ہیں اور یہاں کے کلچر کے متعلق اتنی تھوڑی مدت میں تم کم ہی جان سکتی ہو۔ خیر قصہ مختصر یہ کہ

یہاں کی تعلیم مخلوط ہے اور ہر ملک اور ہر مذہب کے بچے پڑھتے ہیں۔ جس عمل کو اسلام جنسی بے راہ روی کہتا ہے یہاں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ شہلا مجھ سے دو سال چھوٹی ہے اور ابو کے کہنے کے مطابق اسکول میں اس پر میں نظر رکھتا تھا لیکن منع کرنے کے باوجود بھی شہلا کی دوستی منوہر کمار سے بڑھتی چلی گئی۔ امی ابو کو میں بتاتا تو وہ کہتے بچی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جیسے ہی اس نے ہائی اسکول ختم کیا تو کسی دوسری سٹیٹ میں داخلہ لے لیا اور پتا چلا کہ منوہر بھی وہیں چلا گیا۔ ڈیڈ کو تو دل کا دورہ پڑ گیا اور امی سکتے میں چلی گئیں۔ خیر علاج وغیرہ سے دونوں ٹھیک تو ہو گئے مگر ہمارے گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ مجھے تو دنیا سے ہی نفرت ہو گئی۔ شکر ہے اسلامک سینٹر کے ٹیچر زید بن عبداللہ کی Councelling سے میں دوبارہ صحیح سوچنے لگا مگر سلمان چرسی ہو گیا۔ ہم سب آپس میں ایک دوسرے سے بہت attached تھے اور بڑی Close knit فیملی تھی۔ اس لیے شاید شہلا کی حرکت نے سب پر اتنا اثر کیا تھا۔ دادی انہی دنوں آئی تھیں بے چاری بہت ہی پریشان واپس گئی تھیں۔ میں نے اپنے جسم کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''طلال اب شہلا کہاں ہے۔''

''غالباً اس نے منوہر کمار سے شادی کر لی ہے۔''

''ہندو سے شادی؟'' مجھے صرف اپنا اتنا کہنا اور سر چکرانا یاد ہے

اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں صوفے پر لیٹی تھی اور طلال میرے ساتھ بیٹھے میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال رہے تھے اور میرے گالوں کو ہتھیلیوں سے تھپتھپا رہے تھے جیسے ہی میں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش میں آئی۔ طلال نے اطمینان کا سانس لیا اور بولے۔

''لڑکی مروا نہ دینا یہاں تو بغیر سوشل سیکورٹی کے کسی ہسپتال میں داخل بھی نہیں ہو سکتے۔'' تھوڑی دیر بعد شرمندہ سی میں اٹھ کر بیٹھ گئی طلال دو مگ گرم کافی کے بنا لائے۔ جیسے ہی کافی پی میرے ہوش ٹھکانے آئے اور میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''طلال سچ بتائیں شہلا نے ہندو سے شادی کر لی۔''

''ہاں بھئی اگر سچ نہ ہوتا تو مام اور ڈیڈ اس سے ملنا کیوں چھوڑتے۔''

''لیکن کسی مسلمان کی شادی ہندو سے تو ہو ہی نہیں سکتی۔''

''یہ تو ہمارے مذہب کہتا ہے نا جہاں دین کی کوئی وقعت نہ ہو وہاں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اوہو! بہت افسوس ہوا۔'' میں نے سر پکڑ لیا۔ طلال بولے:

''ڈاکٹر کی حیثیت سے میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے وہاں تک چل کر دکھاؤ اور دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالو۔''

''او کے سر!'' میں نے حکم کی تعمیل کی مگر دل آرزردہ ہی تھا اور

پوچھ بیٹھی کہ سلمان کہاں گیا۔ طلال نے بڑے پیارے انداز میں فقرہ کسا۔

''کیوں محترمہ بے ہوش کر بہت مزا آیا ہے اور دوبارہ بے ہوش ہونا چاہتی ہو۔''

''طلال مجھے نیند نہیں آئے گی میں اب کچھ بھی سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو سنو سلمان کو سمیک کی عادت ہوگئی تھی۔ ڈیڈ نے اسے بہت ڈانٹا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بہت ہی کم نمبروں سے اس نے ہائی اسکول پاس کیا اس پر بھی مام اور ڈیڈ دونوں اس کے پیچھے پڑ گئے اور روز روز کی کھچ کھچ سے تنگ آ کر وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا اور کچھ عرصے بعد سنا کہ وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں پتا۔''

''تو کیا مطلب اب آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟''

''کچھ عرصہ تو ابو نے اس کا پیچھا کیا مگر آخر ہمت ہار گئے۔''

میرے اوپر تو منوں اداسی چھا گئی اور مجھے طلال سے دلی ہمدردی ہونے لگی۔

''اوہو! طلال پھر تو آپ بہت دکھی ہوئے نا!''

''کیوں بھئی یہ غلط خبر کس نے اڑا دی۔''

''ابھی خود ہی تو آپ نے اتنی دردناک باتیں بتائی ہیں۔''

''تم کیا جانو ایسی باتیں تو امریکا کے کلچر کی روزمرہ کی باتیں ہیں۔''

طلال نے قدرے بے نیازی سے کہا کیونکہ میرا دل بہت دکھی ہو رہا تھا مجھے لگا کہ طلال بھی دکھی ہو رہے تھے۔ اسی لیے دادی امریکا سے توبہ کرتی تھیں مگر یہ سب باتیں انہوں نے نہ ہی زبانی بتائیں اور نہ ہی اپنی ڈائری میں ان کا ذکر کیا۔

''مومنہ تم نے اپنی زندگی میں کوئی بہت اہم فیصلہ کیا ہے جس پر تمہارا دل اور دماغ دونوں متفق ہوں۔'' طلال نے شاید سلمان اور شہلا سے میرا ذہن ہٹانے کے لیے بڑا عجیب سا سوال کیا۔ میں نے کہا:

''کیا مطلب ہے؟ کوئی فیصلہ بھی دل اور دماغ کو یک جا کر کے ہی کیا جاتا ہے۔''

''ذرا بتاؤ تم نے ایسے کتنے فیصلے کیے ہیں۔'' پتا نہیں طلال اچانک اتنے سنجیدہ کیوں لگ رہے تھے۔

''بولو بھی۔'' میں نے چونک کر جواب دیا۔

''بھئی پڑھائی میں نے اپنی مرضی سے کی۔ اپنا کیریئر اپنی مرضی سے اپنایا۔ بھلا اور کون سے فیصلے کرنے تھے مجھے؟ مگر آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟''

''اب تم سو جاؤ کل بتاؤں گا۔''

طلال کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں اور وہ سونے چلے گئے۔

مجھے بھلا نیند کہاں آنی تھی۔ دادی کی ڈائری کھولی اور صوفے پر لیٹ کر ہی

پڑھنا شروع کر دیا۔ دادی نے لکھا تھا۔

''جب سے مجھے پہلا سٹروک ہوا ہے دل کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ مومنہ ڈاکٹری کے سیکنڈ ایئر میں ہے۔ پڑھائی پوری کرنے میں ابھی دو تین سال باقی ہیں مگر مینہ نے طوفان کھڑا کیا ہوا ہے۔ فون کر کے اسے میں نے بلایا ہے یہ سمجھانے کے لیے کہ مومنہ کا خیال دل سے نکال دے۔ دو تین دن سے سمجھا رہی ہوں مگر ہمیشہ کی طرح اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے اپنے منہ سے اگر میں انکار کر دوں تو قیامت ہی آ جائے گی اگر احسن اور حمیرا کو کہوں تو انکار کر دیں تو بہن بھائی میں ساری عمر کی عداوت بیٹھ جائے گی اور میری زندگی کا نچوڑ اور مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ ان دونوں کی بگڑ گئی تو ظاہر ہے فیروز اور منزہ بھی مینہ کی باتوں میں آ کر اس کا ساتھ دیں گے۔ احسن بے چارہ اکیلا رہ جائے گا۔ یہ میں سوچنا بھی نہیں چاہتی اور مینہ کی ایک ہی رٹ ہے کہ ہر قیمت پر وہ یہ رشتہ کر کے رہے گی کیونکہ احسن کی جائیداد مومنہ کو ملے گی اور کسی دوسرے کو یہ جائیداد ملے مینہ برداشت نہیں کر سکتی۔ جی تو چاہتا ہے کہ احسن کو سمجھاؤں کہ جائیداد بہن کو دے دے اور بچی کی جان چھڑا لے۔ مگر حمیرا کب یہ مانے گی اور احسن اپنا حق چھوڑے بھی کیوں اور اگر مومنہ سے کہوں کہ وہ انکار کر دے تو ساری بات جھٹڑے پر چڑھے گی اور جانے کیا سے کیا بن جائے اور اگر مینہ نے احسن اور حمیرا کو منا بھی لیا تو ظاہر ہے میری جان سے پیاری مومنہ ماں باپ کے آگے کچھ نہ بولے گی اور رشتوں کے بھینٹ چڑھ

جائے گی۔ میں کیا کم بھگت چکی ہوں کہ اب مومنہ کو بھی ویسی ہی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ لگتا ہے اس بوجھ سے سینہ ہی پھٹ جائے گا۔''

ہائے میری پیاری دادی کو میری کتنی فکر تھی۔ ڈائری پڑھتے پڑھتے میرے کان آنسوؤں سے بھر چکے تھے۔ ڈائری بند کر کے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر دن بھر کی تھکاوٹ نہ ہوتی تو شاید ساری رات دادی کے غم اور فراق سے بے چین رہتی مگر کچھ دیر بعد مجھے پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو چچا جان اور طلال جھیل کے کنارے بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر تیار ہوئی اور چچی جان کے ساتھ ناشتہ بنانے میں لگ گئی۔

''مام آج آملیٹ بہت مزے کا ہے کیا خاص چیز ڈالی ہے اس میں؟''

طلال نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔ چچی بولیں:

''پتا نہیں بیٹا مومنہ نے بنایا ہے۔''

''ہوں! یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ آج کل کی لڑکی کو اچھا کھانا پکانا آتا ہو!''

میں نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر طلال کی طرف دیکھ کر اپنی تعریف کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن یہ تو میں ہی جانتی تھی کہ مجھے صرف آملیٹ ہی بنانا آتا ہے۔ ہلکے پھلکے موڈ میں ناشتہ ہوا اور واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں

اور چچی گھر کے اندر کی چیزیں بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سارا کیبن صاف کیا۔ ٹوئلٹ چمکایا، کچن صاف کیا اور چچا اور طلال کرسیاں کشتی اور گرل وغیرہ صاف کر کے سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں طلال اپنی گاڑی میں اور ہم تینوں اپنی گاڑی میں نکل پڑے۔ راستے میں حسب پروگرام کھانے کے لیے رکے آرڈر دے کر دونوں بزرگ واش روم چلے گئے اور طلال کو شاید شرارت کا موقع مل گیا بولے:

''مومنہ تم نے پوچھا تھا کہ کل وہ سوال میں نے تم سے کیوں کیا تھا۔''

''کون سا سوال؟'' میں نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''یہی کہ تم نے خود اپنی زندگی کے اہم فیصلے کیے ہیں۔''

''وہ تو میں نے آپ کو بتا دیئے تھے۔''

''لیکن آخری اور سب سے اہم فیصلہ کرنا تو ابھی رہتا ہے۔''

''بھلا وہ کیا۔''

''اگر میں پوچھوں تو کیا ابھی اپنا فیصلہ سنا دو گی۔''

''یہ تو سوال سننے کے بعد ہی بتایا جا سکتا ہے۔'' میں نے اپنی طرف سے بہت پر اعتمادی سے کہا لیکن اگلا ہی خیال آیا کہ طلال نے بڑے آرام سے مجھے چکر میں تو نہیں ڈال دیا۔ مگر اب تو حامی بھر لی تھی میں نے کہا۔

''ہاں! تو جناب آپ مجھ سے کس سوال کا جواب لینا چاہتے

ہیں؟''

پہلی دفعہ طلال نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

اور مجھے یوں لگا کہ دو صاف شفاف جھیلیں مجھے کسی مقناطیسی قوت سے اپنے اندر کھینچ رہی ہیں۔ میں گھبراہٹ میں کھڑی ہو گئی اور میرے منہ سے ایک چیخ کے ساتھ نکلا۔

''کیا!''

''ارے بھئی بیٹھ جاؤ سب لوگ تمہاری چیخ سن کر تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں اور وہ سمجھیں گے کہ تم نے کہا ہے Ya جس کا مطلب ہے ہاں!''

بے دھڑک میرے منہ سے نکل گیا۔

''یہ میں نے کب کہا۔'' اور میں بیٹھ گئی۔ طلال بولے:

''اس کا مطلب ہے تمہارا فیصلہ ہے'' ''نہیں!'' طلال مجھے ماہر وکیل لگ رہے تھے۔

''میں نے یہ بھی نہیں کہا۔''

''تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے۔''

''طلال میرا مطلب جو بھی ہے خدا کے لیے اپنے پاس سے مطلب نہ نکالیں۔''

''تو پھر تم خود بتا دو نا!''

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ معاملہ کیسے نمٹاؤں کہ چچا چچی آ گئے اور ساتھ ہی کھانا آ گیا۔ طلال کو تو شاید کوئی فرق نہیں پڑا وہ مزے لے لے کر کھا رہے تھے لیکن میرا دل اور دماغ دونوں ہل گئے تھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ کھانے میں کیا تھا۔ سب نے کھا لیا تو میں نے شکر کیا کہ گھر جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے طلال بولے:

''مام میں تین چار دنوں بعد منیا پلس آؤں گا تو شاید گھر کا چکر بھی لگاؤں۔'' اور اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے مجھے کہا۔ ''جواب لکھ کر رکھنا۔'' ان کے جواب میں میرے پاس صرف ایک مسکراہٹ تھی۔ جانے آج کون سا پرفیوم لگایا تھا کہ دیر تک اس کی خوشبو میرے گرد منڈلاتی رہی۔ گھر پہنچ کر رات گئے تک طلال کا سوال میرے دماغ پر سوار رہا اور سوچتی رہی کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ماہا، آمنہ اور شانزے میرے پاس ہوتیں تو مجھے وہ یقیناً ایک سو ایک ترکیبیں اس معمے کو حل کرنے کے لیے بتاتیں۔ میں نے کبھی ایسی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ دادی کی بات یاد آئی کہ اگر کسی مسئلے کا حل فوراً نہ کر سکو تو اسے وقت دو وقت کے ساتھ مسئلے خود حل ہو جاتے ہیں اور اس وقت میں یہی فیصلہ کر کے سو گئی۔ اگلے دن سوچا دادی کی ڈائری ہی مکمل کر دوں۔ دادی نے لکھا تھا۔

''اگر مینہ کی خواہش پوری ہو گئی تو میری ہیرے جیسی بچی گنواروں میں زندگی کیسے گزارے گی۔ مومنہ سے میں نے وعدہ تو لے لیا ہے کہ زندگی

کے اہم معاملات میں آنکھیں بند کر کے کسی کا مشورہ نہ مانے لیکن وقت آنے پر نہ جانے کیا کرے گی۔ اللہ ہی اس کی رہنمائی کرے۔ مینہ نے کل کا دن دیا ہے کہ میں فیصلہ کروں۔ کہتی ہے جواب لے کر ہی جائے گی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہیں دور چلی جاؤں اور کل کا دن میری زندگی سے ہی نکل جائے۔ تہجد پڑھ کر مومنہ کے لیے دعائیں تو بہت کی ہیں اور اللہ سے التجا کی ہے اس گھر کی بنیاد جو صرف رشتوں کی بھینٹ سے پڑی تھی وہ رشتے قائم رہیں اور یہ بچے اتفاق سے رہیں۔''

اور یہ دادی کی ڈائری کا آخری پیراگراف تھا۔ میں اکیلی سسکیاں بھرنے لگی اور زیرِ لب کہتی جاتی تھی۔

''دادی اس رات آپ نے مجھے بریسلٹ بھی تو دیا تھا۔'' لیکن دادی میری بات سننے کے لیے وہاں کون سا موجود تھیں۔ میرا رونا تھمتا ہی نہیں تھا۔ اتنے میں پاکستان سے ابو کا فون آ گیا۔

''بھئی مومنہ امریکا میں خوب مزے کر لیے اب سناؤ واپسی کی سیٹیں ہو گئیں کہ نہیں۔''

''جی ابو سیٹیں ہو گئی ہیں۔ اس ہفتے کو یہاں سے چلوں گی اور اتوار کو نیویارک سے۔'' ابو بولے۔

''فیروز بھائی تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں ایک ہفتہ اور رکنے دوں مگر میں نہ مانا۔ بس اب گھر پہنچو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''جی ابو ان شاء اللہ اگلے ہفتے میں آپ کے پاس ہوں گی۔''

اچھا بیٹی چلنے سے پہلے بھی فون کر دینا۔ سب کو میرا اسلام کہنا اللہ حافظ۔''

حسب عادت ابو نے کام کی بات کی اور فون بند کر دیا۔ میں سوچنے لگی کہ بھلا ابو نے کون سی ضروری بات مجھ سے کرنی ہوگی۔ یقیناً مینہ پھپھو نے مسئلہ کھڑا کیا ہوگا۔ چار دن جو طلال کے آنے میں تھے میرے لیے وہ چار صدیوں پر بھاری تھے۔ سوچتی تھی آخر طلال کو مجھے کیا کہنا چاہیے۔ شکر ہے جس دن انہوں نے آنا تھا وہ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکے اور چچا کو فون پر ہی کہہ دیا کہ ان کی طرف سے خدا حافظ کہہ دیں کیونکہ میں اور چچی کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے..... آخر میں ان کو کیا جواب لکھ کر دیتی ایک طرف دادی کی مصلحتیں، دوسری طرف میری پڑھائی اور امی ابو کا خیال الگ سے۔ اور ادھر طلال جیسی پرکشش شخصیت۔ جلدی میں کوئی فیصلہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن میری سوچ ایک فیصلہ کن مقام پر لا کر مجھے ہمت بھی دیتی تھی فیصلہ کرنے کی۔ اسی تانے بانے میں پاکستان روانگی کا وقت آ گیا۔ صبح چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچے تو میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب طلال کو میں نے ٹرمنل کے دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ بڑے اچھے موڈ میں لگ رہے تھے۔

''ہائے ڈیڈ، ہائے مام، ہائے مومنہ۔'' طلال نے سب کو امریکن

سٹائل میں سلام کیا۔ چچا فیروز نے طلال سے پوچھا۔

''بیٹا آج اتنی صبح کیسے نکل آئے۔''

''ڈیڈی میں نے سوچا مومنہ کو خدا حافظ بھی کہہ دوں اور یہ بھی بتا دوں کہ تقریباً دو ماہ بعد میں سٹڈی ٹور پر پاکستان جاؤں گا لہٰذا میں نے جو انہیں پراجیکٹ دیا ہے اس کی ریسرچ مکمل کر رکھیں۔''

چچا جان نے تو طلال کی بات خاص دھیان سے نہیں سنی کیونکہ وہ پورٹر سے سامان رکھوا رہے تھے۔ البتہ مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگ گئے۔ میں پہلے ہی گھر جانے کے لیے بے چین تھی۔ اب طلال نے نہ جانے کون سی ریسرچ کی بات چھیڑ دی۔ روانگی میں وقت کم تھا پھر بھی ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''بھئی کون سی ریسرچ کرنی ہے مجھے آپ کے لیے۔''

''ارے واہ! اتنی جلدی بھول گئیں۔ میرا ایک عدد سوال تمہارے پاس ہے شاید اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے تمہیں موٹی موٹی کتابیں کنسلٹ کرنی پڑیں گی۔''

جانے مجھے کیوں لگا کہ شرم سے میرے جسم کا سارا خون میری گالوں پر امنڈ آیا ہو۔ پھر بھی ہمت کر کے میں نے طلال سے کہہ ہی دیا۔

''ریسرچ تو شاید یہیں مکمل ہوگئی ہے البتہ فیصلہ پاکستان جا کر ہی ہوگا۔'' طلال کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے تھے چچا کی آواز آئی۔

''چلو بھئی سامان رکھا گیا ہے۔'' سامان چیک ان کروایا اور

دوسرے ٹرمنل کی طرف چل پڑے۔ کچھ ہی دیر بعد بورڈنگ شروع ہوگئی اور اس چھوٹے سے خاندان کو چھوڑنے کا مجھے دکھ بھی ہو رہا تھا مگر پاکستان جانے کی خوشی بھی تھی اور سب سے مزے کی بات کہ شانزے، ماہا اور آمنہ کو بہت کچھ سنانا تھا اور کچھ بتانا بھی تھا۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور دو دلی سی ہو کر سب کو خدا حافظ کہا اور تیز قدموں سے جہاز کی طرف چل پڑی۔ لطیف اور حسین یادوں کے سائے چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے میرے ہمسفر تھے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی جانے دل اداس کیوں ہونے لگا اور میں نے سوچا کہ شاید زندگی کا اہم فیصلہ تو میرے دل نے کر ہی لیا ہے لیکن دادی کی نصیحت اور مصلحتیں اور امی ابو کا سامنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔ خیر یہ تو پاکستان پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔ اچانک ایک اجنبی سی آواز نے چونکا دیا۔

"Mam please fasten your seat belt."

(محترمہ اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں)۔

میں نے اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

تیری جھلیں سمٹ آئیں میری آنکھوں میں چار سو
تیری خوشبو میری سانسوں میں گویا اب بھی ہے باقی

نسرین قریشی

❀❀❀